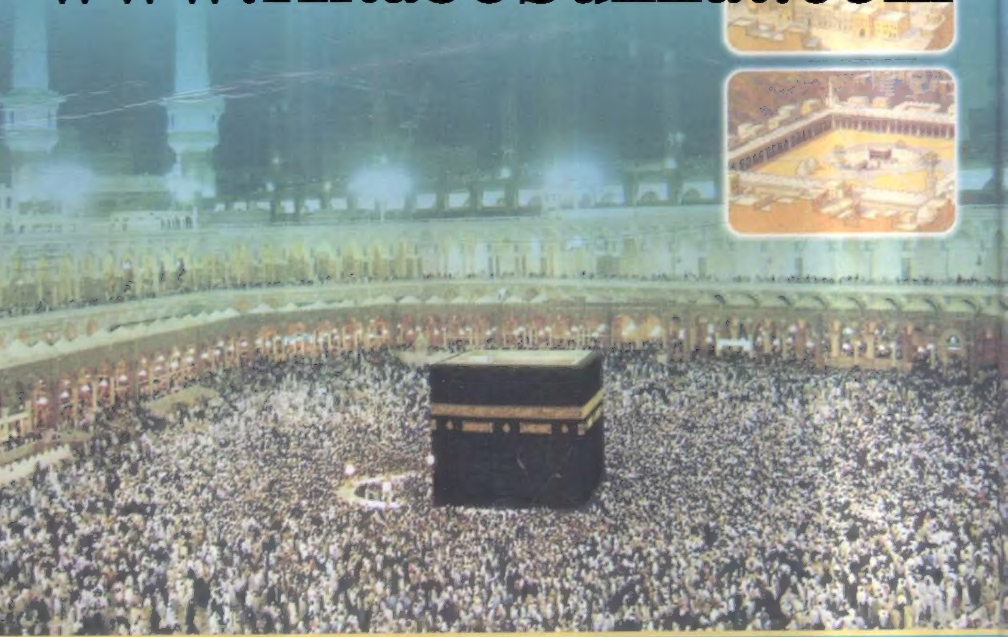
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباؤ اجداد کا تذکرہ

ڈاکٹر محمود الحسن عارف





بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

لم ازل انقل من اصلاب الطاهرين الی ارحام الطاهرات

''میں پاک لوگوں کی پشتوں سے پاک دامن عورتوں کے ارحام میں منتقل ہوتا رہا۔''

محمد رسول اللہ ﷺ کے آباؤ اجداد کا تذکرہ

ڈاکٹر محمود الحسن عارف

چیئرمین اُردو دائرہ معارف اسلامی

پنجاب یونیورسٹی، لاہور

RAHAT PUBLISHERS

یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

راحت پبلشرز، لاہور
عارف، ڈاکٹر محمود الحسن
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء واجداد کا تذکرہ
ص:264   7x4
ISBN 978-969-9202-04-9
① سیرت نبوی ﷺ ② آباء النبی ﷺ
248.71
ع ار۔م

Designed & Composed by:
Qalam-e- Ayaz
0333-4331105, 0301-4144737

محمد رسول اللہ ﷺ
کے آباؤاجداد کا تذکرہ

ڈاکٹر محمود الحسن عارف
+92-42-37460474
hassanarif5@hotmal.com

1431
2010

RAHAT PUBLISHERS
یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور
rahatpublishers@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم


لا إله إلا الله محمد رسول الله

انتساب

محمد رسول اللہ ﷺ کی والدہ قدسیہ

سیدہ آمنہ سلام اللہ علیہا

کے نام

جن کی گود سے جنم لینے والے نور نے

ساری کائنات کو منور کیا

اور امن کا گہوارہ بنایا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء واجداد

باب سوم

باب چہارم

باب پنجم

باب ششم

باب ہفتم

پیش لفظ

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت حسان بن ثابت نے کہا تھا:

احسن منك لم ترقط عيني
واجمل منك لم تلد النساء
خلقت مبرأ من كل عيب
كانك قد خلقت كما تشاء

(آپ ﷺ سے زیادہ حسین شخص میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا اور آپ سے زیادہ خوبصورت فرد کسی عورت نے نہیں پیدا کیا۔ آپ ﷺ ہر عیب اور نقص سے پاک پیدا ہوئے ہیں۔ گویا کہ آپ ﷺ ویسے پیدا ہوئے ہیں جیسے کہ آپ خود چاہتے ہیں۔)

سرورکائنات ﷺ کی ہستی جس طرح انسانی علوم وفنون کا ماخذ وضع ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کی ذات انسانی عظمتوں اور کمالات کی بھی جامع ہے۔ آپ ﷺ کی ذات دنیا کے تمام بڑے اور عظیم انسانوں کے علمی اور جسمانی طور پر وارث ہے اس لیے کہ آپ کے بزرگوں اور اجداد کا بابرکت سلسلہ دراصل دنیا کے بڑے انسانوں اور بڑے لوگوں کا سلسلہ ہے جس کی ہر ایک کڑی اور جس کا ہر ایک سلسلہ پہاڑوں جیسی بلند اور دریاؤں سے زیادہ فیاضی اور سخاوت دکھانے والے لوگوں پر مشتمل ہے۔ اسی لیے آنحضور ﷺ کے اجداد کے بابرکت تذکرے سے ہی سیرت طیبہ کے بابرکت مطالعے کی ابتداء ہوتی ہے۔

کچھ اس بنا پر کہ خاندان نبوی کے بزرگوں کا یہ بابرکت سلسلہ عظمت و بزرگی کا سلسلہ ہے اور کچھ اس لیے کہ ان بزرگوں کے حالات کا مطالعہ خود ذات رسالت مآب ﷺ کا مطالعہ ہے۔ اس لیے اس کتاب میں آنحضور ﷺ کے بزرگوں اور آپ کے اجداد کے حالات جمع کیے گئے ہیں۔

یہ کتاب خاکسار کی ''سیرت طیبہ'' پر آئندہ زیر طبع ہونے والی سیرت طیبہ کے موضوع پر کتب بابرکت سلسلے کی ایک کڑی ہے، اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جن دنوں راقم الحروف قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی کی کتاب ''تقدیس والدین مصطفی ﷺ'' پر کام کیا تھا۔ ان دنوں آپ ﷺ کے بزرگوں اور اجداد کے حالات پر کافی مواد جمع ہو گیا، اسے تاریخی طور پر مرتب بھی کر لیا گیا تھا، لیکن اس کی اشاعت کی نوبت نہ آ سکی۔

اس کی طباعت کا سہرا مکمل طور پر برادر عزیز حافظ زاہد علی صاحب کے سر ہے، جنھوں نے نہ صرف اس کی طباعت کا اہتمام کیا۔ بلکہ اس کی تکمیل کے چھوٹے ہوئے کام کو مکمل کرنے کی بھی ترغیب دی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی جزائے خیر عطا فرمائے۔

میں اس کتاب کی تکمیل کے سلسلے میں اپنے ان تمام دوستوں اور رفقائے کار کا ممنون ہوں جن کی حوصلہ افزائی اور علمی معاونت کی بنا پر میں اس کام کو مکمل کر سکا ہوں، اس سلسلے میں اپنی شعبے کی لائبریری کے انچارج سمیت پنجاب یونیورسٹی مین لائبریری، پنجاب پبلک لائبریری، اور دیال سنگھ لائبریری کے لائبریرین حضرات کا ممنون ہوں، کہ ان کے حسن تعاون سے یہ علمی کام مکمل ہوا۔

اس دوران میری والدہ محترمہ نیک بی بی کی وفات کا صدمہ بھی اٹھانا پڑا۔ اللہ تعالیٰ آں مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

قارئین سے التماس ہے کہ اگر کوئی اچھی بات پائیں تو اس کی حوصلہ افزائی کریں اور اگر کوئی کوتاہی دیکھیں تو اس سے مطلع کریں۔

انہی گذارشات کے ساتھ یہ کتاب پیش خدمت ہے۔

(محمود الحسن عارف)

دار العرفان، ۲/۱۷۰۔ رحمان پارک گلشن راوی، لاہور

رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ/ستمبر ۲۰۰۹ء

مقدمہ

الحمد للہ رب العالمین، والصلوۃ والسلام علی رسولہ الکریم،

سیدنا ومولانا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین، وبعد

''محمد رسول اللہ ﷺ کے آباؤ اجداد'' کے حالات پر بحث سے قبل درج ذیل امور پر روشنی ڈالنا مناسب ہوگی:

① آنحضور ﷺ کے نسب نامہ کی اہمیت وفضیلت۔

② نسب نامہ نبوی کے مختلف مراحل ودرجات۔

③ اجداد نبوی کی شرافت ونجابت

④ آنحضور ﷺ کے آباؤ اجداد کی خدمات جلیلہ۔

⑤ آنحضور ﷺ کے بزرگوں، خصوصاً آپ ﷺ کے والدین ماجدین کے اخلاقی رویے اور ان کے مؤمن ہونے کا مسئلہ۔

تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) آنحضور ﷺ کے نسب نامہ کی اہمیت وفضیلت:

یوں تو ہر انسان کی سیرت وسوانح میں اس کے خاندان اور اس کے بزرگوں کے حالات زندگی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور کسی بھی انسان کی زندگی کا مطالعہ اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتا ...... تاہم ...... عرب وعجم کے سردار اور کائنات ارضی کے تاجدار ...... سرور عالم ﷺ کی حیات طیبہ کا مطالعہ تو آپ ﷺ کے بزرگوں کے حالات زندگی کے مطالعہ کیے بغیر مکمل ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ...... اسی لیے ...... قدیم زمانے سے

ہی آنحضور ﷺ کے حالات زندگی کا مطالعہ...... اسی تاریخی اور آبائی پس منظر میں کیا جا رہا ہے۔

اسی لیے جب معروف بوزنطی حکمران ہرقل کو...... نامہ مبارک نبوی پہنچا اور اس نے آپ ﷺ کے متعلق جاننے کے لیے...... ایلیا یا القدس میں تجارت کے لیے آئے ہوئے، ابوسفیان بن حرب اور ان کے ساتھیوں کو اپنے دربار میں طلب کیا اور آپ ﷺ کے متعلق چند سوالات پوچھے تو ان میں سب سے پہلا سوال آپ ﷺ کے خاندان اور بزرگوں کے بارے میں تھا، چنانچہ اس نے پوچھا:

كيف كان نسبهُ فيكم قلت هو فينا ذو نسب (۱)

ان کا تم میں نسب کیسا ہے؟ میں نے کہا: کہ وہ ہم میں اچھے حسب ونسب والے ہیں

آخر میں جب اس نے ابوسفیان کے جوابات پر تبصرہ کیا......تو کہا:

میں نے تم سے ان کے حسب ونسب کے متعلق پوچھا تھا، تو تم نے بتایا کہ آپ ﷺ ان میں اچھے حسب ونسب والے ہیں...... اسی طرح انبیاء علیہم السلام بھی اپنی قوم کے اچھے حسب ونسب میں مبعوث ہوتے ہیں (۲)

جس سے واضح ہوتا ہے کہ قدیم اور جدید دونوں زمانوں میں ... ہر شخص کی سوانح اور سیرت کی ابتدا...... اس کے بزرگوں اور خاندانوں کے مطالعہ سے ہوتی ہے اور خاندان اور بزرگوں کے حالات کا مطالعہ کیے بغیر کسی بھی فرد کی سیرت وسوانح کا مطالعہ کرنا ممکن نہیں ہے۔

اسی بنا پر خود نبی اکرم ﷺ نے اپنے خاندان کی فضیلت وبزرگی کا صاف اور صریح لفظوں میں تذکرہ فرمایا ہے، چند روایات درج ذیل ہیں: ارشاد نبوی ہے

بعثت من خير قرون بني آدم قرناً فقرناً حتى كنت من القرن الذي كنت منه (۳)

"مجھے اولاد آدم کے بہترین زمانے میں بھیجا گیا...... یہاں تک کہ میں اس زمانے میں مبعوث ہوگیا، جس میں مجھے بھیجنا مقصود تھا"۔

اسی طرح ایک دوسری روایت میں ہے، کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا:

ان اللہ اصطفی کنانة من ولد اسماعیل و اصطفی قریشاً من کنانة واصطفی من قریش بنی هاشم واصطفانی من ...... بنی هاشم (۴)

اللہ تعالیٰ نے خاندان حضرت اسماعیل میں سے اولاد کنانہ کا...... اور بنو کنانہ میں سے قریش کا اور قریش میں سے خاندان بنی ہاشم کا اور بنی ہاشم میں سے میرا انتخاب کیا۔ اسی طرح فرمایا:

ان اللہ اصطفی من ولد ابراهیم اسماعیل واصطفی من ولد اسماعیل بنی کنانة(۵)

حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں اسماعیل کا اور اولاد اسماعیل سے اولاد کنانہ کا انتخاب فرمایا۔

اسی طرح حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان اللہ خلق الخلق فجعلنی فی خیرهم ثم جعلهم فرقتین فجعلنی فی خیرهم فرقةً ثم جعلهم قبائل فجعلنی فی خیرهم قبیلة ثم جعلهم بیوتاً فجعلنی فی خیرهم فانا خیرهم نفساً وانا خیرهم بیتاً(۶)

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو پیدا کیا، تو مجھے ان کے سب سے بہتر لوگوں میں رکھا، پھر ان کی دو جماعتیں کیں، تو مجھے ان میں سے سب سے بہتر جماعت میں رکھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے قبیلے بنائے، تو مجھے ان میں سب سے بہتر قبیلہ میں رکھا، پھر ان کے گھرانے بنائے تو مجھے ان میں سب سے بہتر گھرانے میں رکھا، لہٰذا میں اپنی ذات اور اپنے گھرانے کے اعتبار سے بھی سب سے بہتر ہوں۔"

اسی طرح حضرت عرباض بن ساریہ اسلمی رضی اللہ عنہ رسول اکرم ﷺ سے نقل کرتے ہیں، کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"میں اس وقت (بھی) اللہ تعالیٰ کے ہاں خاتم النبیین لکھا ہوا تھا، جب ابھی

حضرت آدم اپنی مٹی میں تھے اور میں تمہیں اپنے معاملے کی ابتدا کے متعلق بتاتا ہوں...... میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا...... حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کی بشارت اور اپنی ماں کا وہ خواب ہوں جو انہوں نے...... میری پیدائش کے وقت دیکھا تھا اور اس وقت ان کے جسم سے ایسی روشنی پھوٹی کہ جس سے شام کے محلات تک روشن ہو گئے تھے (۷)۔

اسی طرح ارشاد نبوی ہے:

"ان اللہ نظر فی قلوب العباد فوجد قلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم خیر قلوب العباد فاصطفاہ وبعثہ برسالتہ ثم نظر فی قلوب العباد بعد قلب محمد فوجد قلوب اصحابہ خیر قلوب العباد فجعلھم وزراء نبیہ یقاتلون عن دینہ"(۸)

"اللہ تعالیٰ نے تمام بندوں کے دلوں کو دیکھا، تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو تمام لوگوں کے دلوں سے بہتر پایا، تو انہیں چن لیا اور اپنی رسالت کے ساتھ انہیں برگزیدہ کیا، پھر اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ باقی لوگوں کے دلوں کو دیکھا تو اصحاب نبی رضی اللہ عنہم کے دلوں کو سب سے بہتر پایا تو انہیں اپنے نبی کے وزیر اور مددگار بنا دیا، کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے لوگوں سے لڑتے اور جہاد کرتے ہیں"۔

اسی طرح ابن سعد نے بیان کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللہ اختار العرب فاختار کنانۃ من العرب واختار قریشاً من کنانۃ واختار بنی ھاشم من قریش واختارنی من بنی ھاشم(۹)

اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا میں سے عربوں کا، عربوں میں سے بنو کنانہ کا...... اور بنو کنانہ میں سے قریش کا اور قریش میں سے بنو ہاشم کا...... اور بنو ہاشم میں سے میرا انتخاب فرمایا۔

ان روایات سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں...... شروع سے ہی...... یہ فیصلہ کر لیا گیا تھا، کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب عربوں سے کیا جائے گا اور عربوں

میں...... اولاد حضرت اسماعیل کا...... اوران میں سے درجہ بدرجہ اولاد کنانہ کا...... ان میں سے قریش کا اور قریش میں بنو ہاشم کا...... اور بنو ہاشم میں سے آنحضور ﷺ کا انتخاب فرمایا جائے گا، اسی لیے...... یہ بابرکت سلسلہ نسب دنیا کے برگزیدہ ترین افراد...... اور اعلیٰ ترین...... لوگوں پر مشتمل ہے، جس کی ایک ایک کڑی کا نہایت دیکھ بھال کر انتخاب کیا گیا، اسی لیے...... آنحضور ﷺ کے بزرگوں کے حالات...... کا مطالعہ...... سیرت طیبہ ہی کے مطالعے ہی کی طرح اجر وثواب کا باعث ہے۔اس لیے تمام سیرت نگاروں نے اسی سے مطالعہ سیرت کی ابتدا کی ہے۔

(۲) نسب نامہ نبوی ﷺ کے مختلف مراحل

نبی اکرم ﷺ کے نسب نامہ مبارک کے تین حصے ہیں...... ان میں سے پہلا حصہ...... یعنی آنحضور ﷺ سے لے کر...... جناب عدنان تک (کل ۲۱ پشتیں)...... مکمل طور پر صحیح، مستند اور متفق علیہ ہے اور خود نبی اکرم ﷺ سے ثقہ راویوں کے ذریعے مروی ہیں...... اور اس بارے میں کسی ثقہ راوی یا مستند مؤلف سے کوئی اختلاف ثابت نہیں ہے...... اسی بنا پر زیادہ تر نسب نگاروں نے لکھا ہے کہ جناب عدنان تک...... نسب نامہ پوری طرح قابل اعتماد ہے۔

چنانچہ...... ابن ہشام کے شارحین (مصطفیٰ السقا وغیرہ)...... لکھتے ہیں:

"جناب عدنان کے بعد...... نسب نگاروں کا بیان مضطرب ہے...... حتی کہ ہم انہیں کسی ایک جد (بزرگوار) پر متفق ہوتا ہوا نہیں دیکھتے اور اس سے اوپر ہر درجہ پر ان کے مابین اختلاف ہے اور نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ جب آپ خود اپنا نسب نامہ بیان کرتے تو عدنان سے اوپر نہیں جاتے تھے اور فرماتے تھے...... "آگے نسب نگاروں نے جھوٹ بولا ہے"(۱۰)

ابن عبد البر نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے: "میں اپنا نسب نامہ عدنان تک جانتا ہوں اور ان کے بعد مجھے یہ علم نہیں کہ کیا (نسب نامہ) ہے(۱۱)۔

اسی طرح سلیمان رضی اللہ عنہ بن ابی خیثمہ سے مروی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے، ہمیں کسی عالم کے علم اور کسی شاعر کی شاعری میں ایسا شخص نہیں ملا جو معد بن عدنان اور یعرب بن قحطان سے اوپر جانتا ہو"(۱۲)۔

علیٰ ہذا القیاس حافظ ابن عبدالبر القرطبی رحمہ اللہ ...... لکھتے ہیں:

اس شجرۂ طیبہ (یعنی نبی اکرم ﷺ سے لے کر جناب عدنان تک) میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہے (۱۳)۔

بہرحال سیرت نگاروں ...... نے خود نبی اکرم ﷺ اور دوسرے صحابہ کرام سے، اس حصے کو جس طرح روایت کیا ہے، اس کی تفصیل درج ذیل ہیں:

محمد (۱) رسول اللہ ﷺ بن عبداللہ (۲) بن عبدالمطلب (شیبہ) (۳) بن ہاشم (عمرو) (۴) بن عبد مناف (المغیرہ) (۵) بن قصی (زید) (۶) بن کلاب (۷) بن مرّہ (۸) بن کعب (۹) بن لوی (۱۰) بن غالب (۱۱) بن فہر (۱۲) بن مالک (۱۳) بن النضر (۱۴) بن کنانہ (۱۵) بن خزیمہ (۱۶) بن مدرکہ (عامر) (۱۷) بن الیاس (۱۸) بن مضر (۱۹) بن نزار (۲۰) بن معد (۲۱) بن عدنان (۲۲) ......(۱۴)

یہ حصہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا متفق علیہ اور مستند ہے (۱۵) معروف سوانح اور سیرت نگار ...... حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

"یہ حصہ تو وہ ہے، جس کے متعلق کسی بھی شخص نے اختلاف نہیں کیا اور نبی اکرم ﷺ سے، خبر واحد کے درجے کی روایات مروی ہیں کہ آنحضور ﷺ نے اپنا نسب نامہ ...... اسی طریقے سے نزار بن معد بن عدنان تک روایت کیا ہے اور ہم نے سیرت نگاروں اور علماء کا اس بارے میں جو اجماع روایت کیا ہے، وہ دوسری تمام باتوں سے بے نیاز کر دیتا ہے (۱۶)۔

۲۔ نسب نامہ نبوی کا دوسرا حصہ اور تیسرا حصہ

نبی اکرم ﷺ کے نسب نامہ مبارک کا دوسرا اور تیسرا حصہ ...... جو جناب عدنان سے حضرت اسماعیل بن ابراہیم تک اور حضرت ابراہیم سے ...... حضرت آدم علیہ السلام

تک کے مابین آپ کے ...... اجداد پر مشتمل ہے...... مختلف فیہ ہے۔

اس حصے کے متعلق ...... اوپر گزر چکا ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: اس سے آگے نسب نگاروں نے غلط بیانی کی ہے (۱۷)۔

حافظ ابن عبدالبر نے ...... تمام اقوال کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اور نسب نگاروں کے مابین جناب عدنان اور اسماعیل بن ابراہیم علیہ السلام کے اور ابراہیم علیہ السلام اور آدم علیہ السلام کے مابین ...... افراد کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے اور کثرت اضطراب کی بنا پر ہمارے لیے کوئی ایسا طریقہ لکھنا ممکن نہیں ہے، کہ جس میں کوئی اتفاقی وجہ پائی جاتی ہو اور کسی ایسی شے کا جس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہو، معلوم کرنا ممکن نہیں ہے''(۱۸)۔

اسی طرح نبی اکرم ﷺ سے مروی ایک روایت میں مضر بن نزار تک، کے آپ ﷺ کے اجداد کا ذکر ہے، اس کے بعد یہ الفاظ ہیں:

اور جب بھی دو گروہ ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے ان میں سے سب سے بہتر گروہ میں رکھا، یہاں تک کہ مجھے نکاح کے نسب، کے ذریعے حضرت آدم سے لے کر میرے ماں باپ تک مجھے پیدا کر دیا۔ چنانچہ میں نسب اور اپنے بزرگوں کے اعتبار سے تم سب سے بہتر ہوں (۱۹)۔

مؤرخین اور سیرت نگاروں کے مابین ...... حضرت عدنان اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مابین افراد، ان کے زمانوں اور دوسری باتوں میں تو اختلاف پایا جاتا ہے، البتہ ...... ان سب کا اس بات پر اجماع ہے، کہ تمام نزاری قبائل یعنی قبیلہ ربیعہ اور مضر ...... حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں.

چنانچہ حضرت عکرمہ سے ابن جریم نے نقل کیا ہے:

اضلت نزار نسبها من عدنان (۲۰)

نزار نے ...... عدنان سے اوپر کا اپنا نسب نامہ گم کر دیا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہوا کہ بعض مستشرقین کی طرف سے یہ کہنا کہ آنحضور ﷺ کے نسب نامہ میں حضرت ابراہیم کا نام بعد میں شامل کیا گیا۔ سراسر غلط اور

بے بنیاد ہے۔

بہر حال اس حصے کے متعلق کئی باتوں میں اختلاف ہے...... چند اہم امور حسب ذیل ہیں:

(الف) اس حصے کی روایت کا مسئلہ:

سب سے پہلے اختلاف تو یہ ہے کہ اس حصے میں آنے والے بزرگوں کا بطور نسب نامہ نبوی ذکر کرنا آیا جائز ہے یا نہیں؟...... امام مالک بن انس (م ۱۷۹ھ/ ۷۹۵ء) سے مروی ہے:

''ان سے اس شخص کے متعلق پوچھا گیا جو اپنے نسب نامہ کو حضرت آدم علیہ السلام تک بیان کرتا ہے...... تو انہوں نے اسے ناپسند کیا...... پھر پوچھا گیا کہ آپ اس شخص کے متعلق کیا فرماتے ہیں، جو اپنا نسب نامہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تک پہنچاتا ہے ...... تو انہوں نے اسے بھی ناپسند (مکروہ) قرار دیا...... اور کہا کہ اسے ...... اس تفصیلی کی کس نے خبر دی ہے؟ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کے نسب نامہ کو...... بیان کرنے (مثلاً ابراہیم بن فلان بن فلان) کو بھی ناپسند قرار دیا[۲۱]۔ لہٰذا اس روایت کی رو سے اس حصے کو نقل اور روایت کرنا بھی درست نہیں ہے۔

تاہم معروف نسب نامہ نگار السویدی نے ...... مختلف علماء کے حوالے سے اسے جائز قرار دیا ہے اور لکھا ہے:

''ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ ابن جریر وغیرہ اس کے جواز کے قائل ہیں اور امام بخاری وغیرہ علماء کا بھی یہی مسلک ہے۔''[۲۲]۔

(ب) درمیان کے افراد کی تعداد کا مسئلہ:

پھر یہ کہ حضرت عدنان اور حضرت اسماعیل علیہ السلام بن ابراہیم علیہ السلام اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت آدم علیہ السلام کے مابین افراد کی تعداد کتنی ہے؟ اس بارے میں مختلف اقوال مروی ہیں۔ ابن ہشام نے اپنے استاد ...... ابن اسحاق سے جو نسب نامہ روایت کیا ہے، اس میں حضرت عدنان سے حضرت اسماعیل علیہ السلام بن ابراہیم علیہ السلام کے مابین کل سات

پشتوں کا ذکر ہے، یعنی عدنان بن اد (ادد) بن مقوم بن ناحور بن تیرح (تارح) بن یعرب بن یشحب بن نابت بن اسماعیل بن ابراہیم ...... علیہما السلام (۲۳)۔

جبکہ ...... ابن الکلبی نے ...... حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، کہ حضرت معد بن عدنان سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مابین تیس (۳۰) پشتوں کا فرق ہے (۲۴) مگر ان افراد کی تفصیل بیان نہیں کی گئی۔اسی طرح معروف نسب نگار البلاذری نے بھی عدنان اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے درمیان چھ پشتوں کا ذکر کیا ہے۔تاہم ناموں میں اختلاف ہے۔ان کے مطابق ناموں کی تفصیل درج ذیل ہے:

عدنان بن ادد (۱) بن نابت (۲) بن اھمیسع (۳) بن تیمن (۴) بن نبت (۵) بن قیدار (۶) بن اسماعیل علیہ السلام (۲۴)

جبکہ نامور نسب نگار ...... مصعب الزبیری نے ...... جناب معد بن عدنان اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مابین ۳۸ واسطوں کا ذکر کیا ہے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

عدنان بن ادد (۱) بن امین (۲) بن شاجب (۳) بن نبت (۴) بن ثعلبہ (۵) بن عتر (۶) بن بریح (۷) بن محلّم (۸) بن العوام (۹) بن المحتمل (۱۰) بن ذائمہ (۱۱) بن العقبان (۱۲) بن علّہ (۱۳) بن مجذر بن (۱۴) عامر بن (۱۵) عمرو بن (۱۶) ابراہیم بن (۱۷) اسماعیل بن (۱۸) یزن (۱۹) بن الموج (۲۰) بن المطعم (۲۱) بن الطمح (۲۲) بن القسور (۲۳) بن عتو (۲۴) بن وعدع (۲۵) بن محمود (۲۶) بن الزائد (۲۷) بن ندوان (۲۸) بن ابابہ (۲۹) بن دوس (۳۰) بن حصن (۳۱) بن الزرل (۳۲) بن القمیر (۳۳) بن المجشر (۳۴) بن معذر (۳۵) بن صیفی (۳۶) بن نبت (۳۷) بن قیذر (۳۸) بن اسماعیل علیہ السلام۔ (۲۵)

(ج) درمیانی مدت کے بارے میں اختلاف:

پھر افراد کی تعداد کم یا زیادہ ہونے سے دونوں کے مابین زمانے کے کم اور زیادہ ہونے کا بھی فرق پڑ جاتا ہے، اسی لیے ...... علمائے انساب کے مابین ...... تیسرا اختلاف ...... حضرت عدنان اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے درمیان زمانے کی کمی بیشی کا بھی ہے۔

موجودہ تحقیق کی رُو سے ...... جو تورات کی تفصیلات پر اور کسی حد تک آثار قدیمہ پر ...... مبنی ہے ...... حضرت اسماعیل علیہ السلام کا زمانہ ۱۹۴۷ قبل مسیح، یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے ۲۵۱۰ سال قبل بتایا جاتا ہے۔

جبکہ متفق علیہ روایت کی رو سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر ...... جناب عدنان تک ...... آپ کے کل ۲۱ اجداد گزرے ہیں ...... ان میں سے ہر ایک جد امجد کی اوسط عمر (خصوصاً از دواجی زندگی کے آغاز اور بچوں کی ولادت وغیرہ کو شامل کرتے ہوئے) ۳۳ سال کا فرق سمجھیں، تو ...... آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب عدنان تک کل ۶۹۳ سال کی مدت تصور ہوتی ہے، یعنی ...... جناب عدنان کی ولادت ۱۲۴ قبل مسیح قرار دی جاسکتی ہے اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کی رو سے اگر جناب عدنان اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مابین ۳۰ پشتوں کا فرق سمجھیں تو یہ ۹۹۰ سال قرار پاتے ہیں ...... اور اگر مذکورہ بالا ۳۸ اجداد والی روایت کو پیش نظر رکھا جائے تو، ۱۲۵۴ سال کا فرق قرار پاتا ہے۔ دونوں ...... مدتوں کو جمع کیا جائے، تو اول الذکر روایت سے ۱۶۸۳ سالوں کا اور ۳۸ اجداد والی روایت کی رو سے ۱۹۴۷ برسوں کا فرق قرار پاتا ہے۔ یعنی تیس پشتوں والی روایت کی رو سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا سال ولادت ۱۲۱۴ (ق۔م) اور ۳۸ اجداد والی روایت کے تحت ۱۳۷۱، (ق۔م) سال ولادت قرار پاتا ہے۔ جو موجودہ تحقیقات کی روشنی میں درست نہیں ہے، لیکن ...... یہ یقینی بات ہے کہ جو باپ اور بیٹے کے درمیان ۳۳ برسوں کا ہی فاصلہ نہیں ہوگا، بلکہ کہیں اس سے زیادہ اور کہیں اس سے بھی کم ہوگا۔

تورات ...... (۲۶) کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت کے وقت ان کے والد ...... تارح کی عمر ۷۸ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ۸۶ برس تھی (۲۷) اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ان کی عمر پورے سو برس تھی (۲۸) اور تورات کی صراحت کے مطابق اس زمانے میں ...... لوگوں کی عمریں بکثرت ۱۰۰/۱۰۰۰ برس یا اس سے بھی زیادہ ہوتی تھیں ...... ان حالات میں ...... حضرت عدنان اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مابین حقیقی پشتوں، ان کی تعداد، ان کے زمانوں اور پھر ان کے اسماء کے متعلق ...... کوئی ٹھوس اور یقینی بات نہیں کہی جاسکتی ...... اور

بات وہی ہے، جو نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمائی ہے کہ اس سے آگے ...... ''نسب نگار'' جو بیان کرتے ہیں وہ جھوٹ ہے،(۲۹) لہٰذا حضرت عدنان اور حضرت اسماعیل کے مابین ابن ہشام، السمعانی اور ''البلاذری'' کے بیان کردہ نسب نامے ...... بہرحال قطعی طور پر غلط ہیں۔

جبکہ نبی اکرم ﷺ کے نسب نامہ مبارک کا تیسرا حصہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر ...... حضرت آدم علیہ السلام تک کے اجداد وافراد پر مشتمل ہے، قطعی طور پر توریت کے ...... من گھڑت بیانات پر مبنی ہے ......اور یقینی طور پر غلط ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر آیا ...... یہ حصہ ہمارے سیرت نگاروں نے توریت سے لیا ہے...... اسی لیے ...... اس حصے میں ...... افراد کی تعداد میں تو فرق کم ہے۔ البتہ ...... ان کے ناموں کی تعیین میں ...... فرق کافی واضح طور پر نظر آتا ہے...... بہرحال ...... ابن ہشام کی روایت کے مطابق ...... ان کے ناموں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ابراہیم (۱) بن تارح (آذر) (۲) بن ناحور (۳) بن ساروغ (۴) بن راعو (۵) بن فالخ (۶) بن عیبر (۷) بن شالخ (۸) بن ارفخشذ (۹) بن سام (۱۰) بن نوح (۱۱) بن لمک (۱۲) بن متوشلخ (۱۳) بن اخنوخ (ادریس) (۱۴) بن ...... یرد (۱۵) بن مہلیل (۱۶) بن قینن (۱۷) بن یانش (۱۸) بن شیث (۱۹) بن آدم (۲۰) علیہ السلام(۳۰)۔

جبکہ السمعانی نے ...... حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت آدم علیہ السلام کے مابین سترہ (۱۷) افراد کا(۳۱) ذکر کیا ہے، مگر البلاذری رحمہ اللہ نے دو روایات نقل کی ہیں ...... جن کی رو سے دونوں کے مابین ...... سترہ افراد کا فرق ہے اور مصعب الزبیری کے مطابق انیس پشتوں کا ...... فرق ہے(۳۲) ...... لیکن جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، یہ واضح طور پر غلط ہے، اس لیے ...... کہ حضرت آدم علیہ السلام ...... کی پیدائش اور اس کرۂ ارضی پر انسانی زندگی کی ابتدا ...... ہزاروں سالوں کی نہیں، بلکہ لاکھوں سالوں پہلے کی بات ہے ......اور مذکورہ بالا نسب ناموں کے مطابق ...... حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت آدم علیہ السلام کے مابین ...... ان کی اوسط عمر ...... ۳۳ سال فرض کرنے کی صورت میں محض ۶۲۷ سالوں کا فاصلہ نظر آتا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ چونکہ تقریباً ...... ۲۰۰۰ ق م کے لگ بھگ ہے،

تو اس طرح ...... اس دنیا کی کل عمر ساڑھے چار ہزار سال یا اس سے تھوڑی سی زیادہ قرار پاتی ہے، جو قطعی طور پر غلط ہے.

(۳) نسب نامہ مادری:

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کا نسب چوتھی سیڑھی پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پدری نسب نامہ سے جا ملتا ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

آمنۃ بنت وہب (۱) بن عبد مناف، (۲) بن زہرہ، (۳) بن کلاب، (۴) بن مرہ ...... (۳۳)۔

اسی طرح والد اور والدہ دونوں کے نسب کلاب بن مرہ پر جا کر یکجا ہو جاتے ہیں.

(۴) اجداد نبوی کی نجابت وشرافت:

اس بات پر تمام سوانح نگاروں اور نسب نگاروں کا اتفاق ہے کہ سلسلہ نسب کی تمام کڑیاں اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اجداد ...... نجابت وشرافت اور عزت ونیک نامی کا پیکر تھے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ محترمہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام نانیاں اور دادیاں ...... بھی پاک باز ...... اور باوقار خواتین تھیں ...... اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے تمام بزرگ شرعی طریقہ نکاح سے پیدا ہوئے ...... اور آپ کا سارا سلسلہ نسب محترم اور نامور بزرگوں پر مشتمل ہے ...... وہ سب اپنے اپنے دور میں سردار اور اپنے اپنے قبیلوں یا اپنے اپنے علاقوں میں قائد تصور ہوتے ہیں (۳۴) ...... اس بات کا ذکر ...... خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک حدیث مبارکہ میں کیا ہے ...... چنانچہ ...... معروف سیرت نگار ...... ابن سعد (م ۲۳۰) نے ...... ابن الکلبی سے روایت کی ہے اور لکھا ہے:

”میں نے ...... نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ سو ماؤں (مراد ...... نانیاں اور دادیاں ہیں) کے نام لکھے ہیں، میں نے ان میں سے کسی میں برائی اور زمانہ جاہلیت کی کوئی برائی نہیں پائی (۳۵)، چنانچہ نامور سیرت نگار ...... ابن ہشام ...... نسب نامہ نبوی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اوسط قومه نسباً واعظمهم نسباً من قبل ابیه وامه صلی اللہ علیه وسلم(۳۶)

''لہٰذا رسول اللہ ﷺ اپنے مقام نیز اپنے والد اور اپنی والدہ کی طرف سے اپنے نسب نامہ کے اعتبار سے سب سے زیادہ باعظمت ہیں''۔

اسی طرح السمعانی رحمہ اللہ نے ...... اس مضمون کی کئی احادیث نقل کی ہے، کہ جن میں آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ

''حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر میرے ماں باپ کے ہاں میری پیدائش تک (میرے تمام بزرگوں کی پیدائش) ...... ہمیشہ نکاح سے ہوئی کبھی سفاح (بغیر نکاح کے تعلق) سے نہیں ہوئی، لہٰذا میں حسب ونسب اور اپنے بزرگوں کے اعتبار سے سب سے بہتر ہوں''۔(۳۷)

(۵) آنحضور ﷺ کے آباء واجداد کی خدمات جلیلہ:

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد کی فہرست میں یوں تو حضرت اسماعیل اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ...... اور حضرت نوح علیہ السلام، حضرت شیث علیہم السلام جیسے انبیاء اور اللہ تعالیٰ کے نیک اور برگزیدہ بندے شامل ہیں، لیکن ...... اگر انبیاء علیہم السلام ...... کی خدمات اور کارناموں کو الگ کردیا جائے اور آنحضور ﷺ کے اجداد کے اس بابرکت سلسلے کو ہی پیش نظر رکھ لیا جائے، جو ...... جناب عدنان سے شروع ہو کر جناب عبد اللہ...... آپ ﷺ کے والد محترم ...... تک پہنچتا ہے، تو اس فہرست میں شامل بزرگوں کی خدمات اور کارنامے ...... بھی ...... ایسے ہیں جو دنیا کی تاریخ میں انہیں دوسرے لوگوں سے بے حد منفرد اور دوسروں سے ممتاز بناتے ہیں ...... تفصیل درج ذیل ہے:

(الف) بیت اللہ شریف کی تعمیر وآبادی:

آنحضور ﷺ کے اجداد کا سب سے بڑا اور سب سے مہتم بالشان کارنامہ، جس پر بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے، وہ صدیوں تک ...... اللہ تعالیٰ کے گھر کی حفاظت

وصیانت اور اس کی تعمیر و آبادی ہے ...... یہ وہ خدمت ہے، جو اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں سے لیتا ہے اور جس کی ابتداء حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند ارجمند حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ہوئی، قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (۳۸)

اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل (علیہما السلام) سے یہ عہد لیا کہ وہ میرے گھر کو طواف اور اور اعتکاف کرنے اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے صاف رکھیں گے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کے گھر کی تعمیر وآبادی کو اہل ایمان کی شان قرار دیا گیا، فرمایا:

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ (۲۹)

اس کے سوانہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کو وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے اور نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

چنانچہ ان آیات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ''خانہ خدا'' کی حفاظت وصیانت، اس کی خدمت وتولیت، اس کی تعمیر وخدمت وغیرہ کے کام ...... جو آنحضور ﷺ کے اجداد نے صدیوں تک انجام دیئے اور جن کی وجہ سے امن وسلامتی، محبت والفت ...... اور عبادت وتقدیس الٰہی کا یہ عظیم الشان مرکز نہ صرف قائم رہا، بلکہ ہر آن اور ہر گھڑی اس کی شان وشوکت میں اضافہ ہوتا رہا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ آنحضور ﷺ کے اجداد ...... نے اللہ تعالیٰ کے اس گھر کی خدمت کے لیے ایسے انداز اور ایسے اطوار اختیار کیے، جو دنیا بھر میں کسی اور گھر کی تعظیم وتقدیس اور اس کی حفاظت وخدمت کے لیے اختیار نہیں کیے گیے، مثال کے طور پر اس کی دیواروں کو مٹی اور گرد وغبار سے بچانے کے لیے اس کی دیواروں پر ''کپڑے کا غلاف'' چڑھایا گیا...... اس کے دروازے کی عظمت اور اس کی شان کو بڑھانے کے لیے

بیت اللہ کے دروازے پر سونے کے ''پترے'' چڑھائے گئے اور جب اس کی تعمیر اور بحالی کا کام ... کیا گیا، تو اس کے لیے حلال کمائی کی شرط رکھی گئی اور صرف وہی چندہ یا عطیہ قبول کیا گیا جو نیک اور پاک وحلال کمائی سے دیا گیا تھا.

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس مقدس ومتبرک گھر کی جس عمدہ اور جس اعلیٰ پیمانے پر حفاظت وصیانت اور اس کی خدمت اور نگہداشت کا بندوبست...... آنحضور ﷺ کے اجداد نے صدیوں تک جاری رکھا...... یہ بہت بڑی سعادت اور بہت بڑی خدمت تھی، جو اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں سے لی اور اس کی بنا پر یہ تمام اجداد نبوی پوری انسانیت کی طرف سے ہدیۂ تحسین وتبریک پیش کیے جانے کے مستحق ہیں.

علاوہ ازیں ان دو اڑھائی ہزار برسوں میں اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، کہ ''بیت اللہ شریف کی عمارت کتنی مرتبہ شہید ہوئی اور کتنی مرتبہ بنی اور اس پر کتنی مرتبہ غلاف چڑھایا گیا یہ سب خدمت آنحضور ﷺ کے بزرگوں نے نہایت محبت اور جان فشانی سے انجام دی...... نبی اکرم ﷺ نے جناب زہرہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وهو اول من جدد البيت بعد كلاب بن مرة (۴۰)

اور وہ کلاب بن مرہ کے بعد پہلے شخص ہیں، جنہوں نے بیت اللہ شریف کی از سر نو عمارت بنائی.

(ب) حجاج کرام کی خدمت وتواضع

آنحضور ﷺ کے اجداد کو اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کی خدمت اور اس کی نگہداشت کے ساتھ یہ شرف اور یہ سعادت بھی عطا فرمائی تھی کہ انہوں نے ...... بیت اللہ شریف کی زیارت اور حج وعمرہ کرنے کے لیے یہاں آنے والے لوگوں کی خدمت وتواضع کی اعلیٰ ترین اور عمدہ ترین روایات قائم کیں ...... اس ضمن میں ...... جناب قصی بن کلاب نے ...... جو عہدے قائم کیے ...... ان میں ''الرفادۃ'' اور ''السقایۃ'' کے عہدے خصوصی طور پر حجاج ومعتمرین کی خدمت وتواضع سے متعلق تھے ......(۴۱) انہوں نے اس مقصد کے لیے قریش پر ٹیکس لگایا اور اس موقع پر اپنے لوگوں سے جو خطاب کیا، اس میں

انہوں نے فرمایا:

''اے گروہ قریش تم لوگ اللہ تعالیٰ کے ہمسائے اور اس کے حرم کے باشندے ہو اور حجاج اللہ تعالیٰ کے مہمان اور اس کے گھر کی زیارت کرنے والے لوگ ہیں، لہٰذا تم ان کے لیے چندہ دیا کرو، تاکہ حج کے دنوں میں تم ان کے لیے کھانا تیار کرسکو، جس سے ضرورت مند حاجی فائدہ اٹھائیں گے، اگر میرے مال میں اتنی گنجائش ہوتی، تو میں تن تنہا اس خدمت کو انجام دینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا''(۴۲)

اس مقصد کے لیے ...... آپ ﷺ کے اجداد نے مختلف مقامات پر کنوئیں کھدوائے، جن میں آپ کے جد امجد مرہ بن کعب نے عرفات کے قریب اور جناب لوی بن غالب نے مکہ مکرمہ سے باہر ایک کنواں کھدوایا تھا، جبکہ جناب قصی نے مکہ مکرمہ کے اندر ایک کنواں کھدوایا، جس کا نام العجول تھا اسی طرح جناب ہاشم نے المستنذر کے قریب ایک کنواں کھدوایا تھا(۴۳)

پھر جناب قصی کے زمانے سے لے کر، آنحضور ﷺ کے جد امجد جناب عبدالمطلب تک آپ کے تمام اجداد ہر سال حاجیوں کی خدمت و تواضع کے لیے بہت بڑی مقدار میں مال صرف کرتے تھے، وہ چمڑے کے حوض بنوا کر بئر زمزم کی جگہ رکھواتے اور ان میں پانی جمع کرتے۔ کہا جاتا ہے...... کہ یہ پانی خاص طور پر میمون نامی کنوئیں سے پانی لایا جاتا تھا، اور یوم الترویہ (۸ ذوالحجہ) کو پہلا کھانا مکہ مکرمہ میں، پھر منیٰ پھر عرفہ اور پھر منیٰ میں ان کی طرف سے کھانا دیا جاتا تھا، جو روٹی گوشت یا روٹی اور گھی، ستو اور کھجوروں وغیرہ پر مشتمل ہوتا تھا(۴۴) اور لطف کی بات یہ ہے کہ جب جناب قصی بن کلاب کے بعد ان کی اولاد میں عہدوں کی تقسیم ہوئی...... تو کرّ و فر والے عہدے دوسرے خاندانوں کے پاس چلے گئے اور حجاج کرام کی خدمت و تواضع والے عہدے ...... خصوصاً الرفادہ اور السقایہ بدستور ...... نبی اکرم ﷺ کے خاندان میں متوارث رہے(۴۵) اور آپ ﷺ کے اجداد اور خاندان کے لوگ اسی خدمت پر کمربستہ رہے...... آنحضور ﷺ نے جب حجۃ الوداع ادا کیا، تو اس سال بھی یہ خدمت ...... حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا خاندان انجام دے رہا تھا۔

آپ کے جد امجد جناب قصی نے ...... حجاج کرام کے لیے ...... مزدلفہ میں روشنی اور آگ جلانے کا بندوبست کیا، تاکہ حج بیت اللہ ادا کرنے والے لوگ آسانی سے اپنی منزل تک پہنچ جائیں اور روشنی اور آگ کی بنا پر ...... انہیں وہاں کے قیام میں کوئی دقت اور دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے (۴۵) جیسا کہ طبقات ابن سعد میں ہے:

وقصي احدث وقود النار بالمزدلفة حين وقف بها حتى يراها من دفع من عرفة ...... فلم تزل توقد تلك النار تلك اللَّيلة يعني ليلة جمع في الجاهلية (۴۶)	جناب قصی نے مزدلفہ میں آگ جلانے کا سلسلہ شروع کیا، یہ آگ ہر اس شخص کو نظر آتی تھی جو عرفہ سے لوٹ رہا ہوتا، یہ آگ اس وقت سے مسلسل جلائی جا رہی ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد جناب ہاشم کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور بھی اعزاز بخشا، وہ یہ کہ ...... ان کے زمانے میں مکہ مکرمہ میں سخت قحط پڑا اور لوگ اچھا کھانا ...... کھانا بھول گئے، جناب ہاشم ...... ان دنوں شام کے علاقے میں تھے، انہوں نے وہاں روٹیاں تیار کرائیں اور مکہ مکرمہ میں لا کر ان کو توڑا اور اونٹ ذبح کر کے ...... ان کے شوربے میں ڈال کر ان کا ثرید تیار کیا ...... اور مکہ مکرمہ کے لوگوں کو ...... یہ کھانا کھلایا جس کی بنا پر ...... ان کا نام ہی بنی ہاشم پڑ گیا ...... (۴۷)

(ج) اہل مکہ کا معاشی استحکام:

جناب ہاشم ...... بڑے رعب اور دبدبے والے بزرگ تھے ...... تمام لوگ ان کا احترام کرتے تھے، انہوں نے اس علاقے کے لوگوں کے معاشی استحکام اور ان کی اقتصادی بقا کے لیے، موسم سرما اور موسم گرما کے تجارتی کاروانوں کا بندوبست کیا ...... اور ایک طرف بوزنطی حکمران قیصر سے اور دوسری طرف حبشہ کے حاکم نجاشی سے تجارتی وفود کے ساتھ وہاں جانے کی اجازت حاصل کی، جس کا حوالہ قرآن کریم میں بھی دیا گیا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے اپنا ان پر احسان قرار دیا ہے کہ ان کے دو تجارتی کارواں سال بھر میں ...... مختلف علاقوں کے تجارتی سفر کے بعد کامیاب اور کامران ہو کر لوٹتے

ہیں (۴۸) اور جو اللہ تعالیٰ نے ایک طرف ان کے معاشی تحفظ کا بندوبست ہے اور دوسری طرف انہیں ...... راستوں کے خطروں اور مصائب سے نجات بچاتے ہیں.

اسی طرح آپ ﷺ کے جد امجد جناب عبد المطلب بھی بڑے عظیم مدبر اور بڑے سخی بزرگ تھے۔ غرباء اور مساکین کے علاوہ اہل مکہ اور حجاج کرام کی خدمت و تواضع کرنا ...... ان کا خصوصی مشغلہ تھا اور مشکلات اور پریشانیوں کے وقت وہ اپنی قوم کی رہنمائی فرماتے، چنانچہ جب مکہ مکرمہ میں قحط پڑا، تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کی جس سے قحط سالی دور ہوگئی، اس طرح جب ابرھہ نے مکہ مکرمہ پر حملہ کیا تو جناب عبد المطلب نے گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی (۴۸)۔ جس کی تفصیل آئندہ اپنے مقام پر بیان ہوگی.

(د) بئر زمزم کی دریافت اور کھدوائی

آنحضور ﷺ کے اجداد کے عظیم کارناموں میں سے ایک اہم ترین اور وقیع ترین کارنامہ ...... بئر زمزم کی بازیافت اور اس کی کھدوائی ہے ...... یہ کنواں اللہ تعالیٰ کی نعمت عظمیٰ کی حیثیت رکھتا تھا ...... جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ کی زندگی بچانے کے لیے جاری فرمایا تھا۔

پھر جب بنوخزاعہ نے ''حرم مکہ'' پر قبضہ کیا ...... تو بنو جرہم نے یہ کنواں مٹی ڈال کر پاٹ کیا تھا، چنانچہ مدتوں یہ کنواں ...... دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ رہا، کسی کو کچھ علم نہ تھا، کہ یہ کنواں کہاں واقع ہے اور نہ ہی اس دوران میں اس کو تلاش کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش ہی ہوئی.

لیکن جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حقیقی وارث کی آمد کا وقت قریب آیا تو اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس کا بندوبست کر دیا اور جناب عبد المطلب کو ...... اس کنوئیں کی خواب میں جگہ دکھلا کر اس جگہ کو کھودنے کا حکم دیا۔ ...... جناب عبد المطلب نے جب وہاں کھدائی کرنا چاہی تو قریش مکہ نے ان کا مذاق اڑایا ...... لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ صدیوں پرانا یہ چشمہ دوبارہ دریافت ہو گیا ہے، تو ان کی آنکھیں مارے

حیرت کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں (۵۰) اور انہوں نے یہ چاہا کہ انہیں بھی اس اعزاز میں شریک کر لیا جائے، لیکن جناب عبدالمطلب نے ...... انکار کر دیا۔

بہر حال اس عظیم الشان دریافت اور اس کی دوبارہ تعمیر ...... اور پھر اس کنوئیں کی حفاظت و صیانت اور اس کے پانی کی ...... عوام تک بہم رسانی کو ...... محمد ﷺ کے اجداد کی عظیم ترین خدمت شمار کیا جا سکتا ہے۔ جو یقیناً ان بزرگوں کی اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت کی عظیم علامت ہے۔

(ہ) دین اسماعیلی کی حفاظت

آنحضور ﷺ کے اجداد کے مہتم بالشان کارناموں میں باقیات دین اسماعیل علیہ السلام کی حفاظت و صیانت کرنا بھی شامل ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دین کی باقیات میں سب سے اہم تو ...... "مناسک حج و عمرہ" ہیں ...... جن کے متعلق قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا (۵۱) اے اللہ ہمیں ہمارے حج کے طریقے سکھا

چنانچہ ...... اللہ تعالیٰ نے یہ مناسک ...... حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو تعلیم دیئے اور انہوں نے ان مناسک کی تعلیم اپنی آل و اولاد کو عطا فرمائی۔

مؤرخین کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام کا زمانہ قریباً ۱۹۴۷ ق م کا ہے، اس میں اگر ...... آنحضور ﷺ کی بعثت مبارکہ تک کے ۶۱۰ سال بھی شامل کر لیے جائیں، تو یہ تقریباً اڑھائی ہزار صدیوں کا زمانہ قرار پاتا ہے ...... اس طویل مدت تک جس طرح عربوں میں مناسک حج محفوظ رہے ...... اور چند جزوی تبدیلیوں کے سوا کوئی بڑی تبدیلی ان میں واقع نہیں ہوئی ...... اور حج بیت اللہ کی اہم ترین عبادت ...... حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے طریقے اور ان کے دستور کے مطابق جاری رہی ...... تاریخ عالم کا یہ افتخار بھی بڑی حد تک نبی اکرم ﷺ کے بزرگوں کو جاتا ہے۔

یہاں یہ امر خصوصاً قابل ذکر ہے، کہ مناسک حج میں جو مرور ایام سے جو تبدیلیاں واقع ہوئیں وہ کچھ بڑی اور اہم نوعیت کی نہیں تھیں ...... مثال کے طور پر

......انہوں نے حج بیت اللہ کے تلبیہ میں الا شریکاً ھو تملکه لک وما ملک ...... کے الفاظ شامل کر لیے تھے، اسی طرح قریش مکہ عرفات میں، یعنی حرم سے باہر جانا اپنی کسر شان سمجھتے تھے، البتہ باقی لوگ حسب قاعدہ عرفات جاتے تھے......، اسی طرح...... اوس اور خزرج کے قبیلے صفا اور مروہ کے مابین سعی سے گریز کرتے تھے...... (۵۲) اس کے علاوہ حج کے دنوں کو آگے پیچھے کرنے کی رسم...... جسے نسی یا کبیسہ گری کہا جاتا تھا، انہوں نے ایجاد کر لی تھی ......لیکن یہ تبدیلیاں ان تبدیلیوں کے مقابلے میں جو دوسری قوموں، مثلاً یہودیوں اور عیسائیوں نے باوجود اہل کتاب ہونے کے، پیدا کر لی تھیں اور محض چند ہی برسوں میں اپنے مذہب کے حلیے تک کو بدل ڈالا تھا اور ان کے اصل مذہب کی کوئی ایک بات بھی باقی رہنے دی تھی، بہت کم ہیں.

اس کے علاوہ نذر و نیاز اور قربانی کے صدقے اور راہ خداوندی میں...... مال خیرات کرنے...... غریبوں اور مساکین کی امداد کرنے...... وغیرہ کے تصوارت اور نظریات جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ادیان میں موجود تھے، جوں کے توں باقی رہے، جو یقیناً ایک بہت بڑی بات ہے اور خصوصاً ان حالات میں کہ ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب یا صحیفہ یا کوئی دستاویز تک موجود نہ تھی۔ اس لیے...... اگر یہ کہا جائے تو عین مناسب ہوگا کہ صدیاں گزرنے کے باوجود یہ لوگ بدستور...... توحید کے قریب رہے اور یہ لوگ فطرت اصلیہ" یا "فطرت اسلامیہ" کے بڑی حد تک قریب تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں نبی آخر الزمان کی بعثت کے لیے انہی کا انتخاب ہوا.

جناب عبد المطلب نے جب بئر زمزم کی دریافت کے بعد...... یہ نذر مانی، کہ اگر اللہ تعالیٰ انہیں دس بیٹے عطا کر دے اور وہ سب جوان ہو جائیں تو وہ ان میں سے کسی ایک کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دیں گے...... اور پھر جناب عبد اللہ کے بدلے میں ایک سو اونٹ قربان کیے...... جس سے دیت کے طور پر ۱۰۰ اونٹوں کی ادائیگی کا دستور اور قاعدہ وجود میں آیا۔ جو نبی آخر الزمان کے دین میں بھی باقی رہا۔ علاوہ ازیں حج بیت اللہ کے موقع پر...... قربانی ہدی اور قلائد وغیرہ کی رسوم کی موجودگی سے دین حضرت اسماعیل کی باقیات کی موجودگی کا واضح تاثر ملتا ہے.

(و) مظلوم اور بے کس لوگوں کی امداد واعانت

مکہ مکرمہ میں صدیوں سے آباد نبی اکرم ﷺ کے اجداد میں دین اسماعیلی سے متعلق جو باتیں وقت اور زمانے کی طوالت کے باوجود باقی رہ گئی تھیں اور انہیں اللہ تعالیٰ نے دین اسلام میں شامل کر لیا۔ ان میں ایک اہم ترین بات بے کس اور مظلوم لوگوں کی امداد واعانت بھی ہے...... اوپر گزر چکا ہے کہ جناب قصی نے حج کے لیے آنے والے غریب اور مفلس لوگوں کے لیے ایک فنڈ قائم کیا تھا، جس میں مکہ مکرمہ کے تمام لوگ اپنا حصہ ڈالتے تھے۔ اس کے علاوہ نبی اکرم ﷺ کے اجداد ہر زمانے اور ہر دور میں مظلوموں اور بے کسوں کی امداد واعانت کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔

اس ضمن میں مؤرخین نے خصوصی طور پر...... ''حلف الفضول'' کا ذکر کیا ہے، جس میں ...... نبی اکرم ﷺ کے بزرگوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا، چنانچہ سیرت ابن ہشام میں ہے:

''قریش کے کچھ قبائل نے ایک دوسرے کو ایک معاہدے کی دعوت دی چنانچہ وہ عبداللہ بن جدعان بن عمرو بن کعب کے مکان پر ان کی بزرگی اور سن رسیدہ ہونے بنا پر اکٹھے ہوئے ...... اور اس معاہدے میں خاندان ہاشم، خاندان مطلب، خاندان اسد بن عبدالعزی، زہرہ بن کلاب اور تیم بن مرہ شامل ہوئے، ان لوگوں نے ایک دوسرے سے یہ پختہ عہد کیا، کہ اگر مکہ مکرمہ میں کوئی مقامی یا غیر مقامی شخص مظلوم ہوا، تو ہم سب لوگ اس کا ساتھ دیں گے۔ جب تک کہ اسے اس کا حق نہیں مل جاتا (۵۲)۔

مؤرخین کے مطابق جب یہ واقعہ پیش آیا اس وقت ...... آنحضور ﷺ کی عمر مبارک بیس برس تھی، آپ بھی اس میں شامل ہوئے تھے۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

''میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں، ایک ایسے معاہدے میں شامل ہوا، جس کے بدلے مجھے سرخ اونٹوں کا ملنا بھی پسندیدہ نہیں ہے اور اگر مجھے اس معاہدے کا نام لے کر زمانہ اسلام میں بھی بلایا جائے، تو میں ضرور اس کی بات مدد کروں گا'' (۵۳)۔

نامور سیرت نگار السہیلی نے بیان کیا ہے، کہ یہ معاہدہ سب سے پہلے ...... بنو

جرہم کے تین افراد ...... نے کیا تھا، جس کے نام میں "فضل" مشترک تھا، یعنی الفضل بن شراعہ، الفضل بن وداعۃ اور الفضل بن خضاعۃ ...... جب قریش مکہ کو دوبارہ کسی ایسے معاہدے کی ضرورت محسوس ہوئی، تو انہوں نے اسی معاہدے کی دوبارہ تجدید کر لی.

معاہدے کی تجدید کی ضرورت کیوں پیش آئی، سیرت نگاروں کا مطابق کہ اس کی وجہ یہ تھی، کہ زبید کا رہنے والا ایک تاجر اپنے سامان کے ہمراہ یہاں آیا، تو اس سے العاصی بن وائل نے ...... یہ سامان خرید لیا، مگر اس نے اس کی رقم دبالی، اس کا خیال تھا وہ اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے، اس نے اس سلسلے میں بنو عبدالدار، بنو مخزوم، بنو جمع، بنو سہم اور بنو عدی بن کعب سے مدد کی درخواست کی، لیکن چونکہ العاصی بہت امیر شخص تھا، اس لیے انہوں نے اس اجنبی کے مقابلے میں اپنے بھائی کا ساتھ دیا۔ اس پر الزبیدی عین اس وقت جب سورج طلوع ہو رہا تھا، جبل ابی قبیس پر چڑھ گیا، اس وقت قریش مکہ اپنی اپنی مجالس میں بیٹھے تھے اور اس نے چیخ چیخ کر مدد کی درخواست کی، اس پر سب سے پہلے جناب عبدالمطلب کے بڑے صاحبزادے ...... زبیر کھڑے ہوئے اور انہوں نے مظلوم کا ساتھ دینے کا اعلان کیا ...... پھر دوسرے قبائل کو بھی اس بارے میں ساتھ دینے کے لیے بلایا، چنانچہ ...... اس کے بعد یہ معاہدہ ہو گیا (۵۴) اور ان سب نے مل کر اجنبی کو اس کا حق العاصی بن وائل سے لے کر دیا.

لطف کی بات یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی ننھیال اور ددھیال دونوں اس معاہدے میں شریک تھے.

یہ معاہدہ دنیا میں حقوق انسانی کی حفاظت وصیانت اور اس کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دینے کا شاید قدیم ترین معاہدہ تھا، جس کو بحال کرنے کا شرف ...... نبی اکرم ﷺ کے خاندان کو جاتا ہے۔

(٦) اجداد نبوی کے مومن ہونے کا مسئلہ اور اس کے دلائل

علاوہ ازیں ...... نبی اکرم ﷺ کے بزرگوں کے تفصیلی حالات تو اگرچہ کسی مجموعے میں دستیاب نہیں ہیں، البتہ ان کے جن چیدہ چیدہ حالات کا ذکر ملتا ہے، ان

سے واضح ہوتا ہے کہ یہ لوگ اخلاقی، انسانی اور ایمانی طور پر بھی اعلیٰ ترین بلندیوں پر فائز تھے، امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ اور دوسرے سیرت نگاروں نے لکھا ہے:

و رووا ان آباءہ صلی اللہ علیہ وسلم کلّھم الی آدم کانوا علی التوحید(۵۵)

روایات میں آیا ہے، کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اجداد حضرت آدم علیہ السلام تک توحید پر قائم تھے۔

اور چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد آذر (یا تارح) کے متعلق قرآن کریم میں صراحت ہے، کہ وہ مشرک تھے اسی لیے امام فخر الدین رازی نے لکھا ہے، کہ آذر ...... حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا تھے اور والد نہ تھے(۵٦)، اسی طرح خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

لم ازل انقل من اصلاب الطاهرین الی ارحام الطاهرات(۵۷)

میں پاک لوگوں کی پشتوں سے پاک دامن عورتوں کے ارحام میں منتقل ہوتا رہا۔

چنانچہ جیسا کہ اوپر گزرا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد...... صدقہ و خیرات سے لے کر...... ہر طرح کے نیک کاموں اور دور جاہلیت میں بھی صدیوں تک نکاح و طلاق اور دوسرے اسلامی احکام کی پابندی کرتے رہے، اس کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کی چھوڑی ہوئی بہت سی سنتوں، یعنی ختنے، عقیقے، قربانی، داڑھی بڑھانے، مونچیں کٹوانے ...... موئے زیر ناف صاف کرنے، بغلوں کی صفائی، عمامہ باندھنے اور ساتر لباس پہننے، جیسے امور کا اہتمام کرتے رہے، جن کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''فطرت'' ہونے اور انبیاء کی سنتیں ہونے کی خود وضاحت کی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے امور کی حفاظت کرنا ایک ایسی بات ہے، جو اللہ تعالیٰ کی تائید وحمایت کے بغیر ممکن نہیں۔

غریبوں، مساکین اور مظلوموں کی امداد واعانت اور انبیاء علیہم السلام، خصوصاً حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی چھوڑی ہوئی عبادتوں اور ان کی سنتوں

کی حفاظت وصیانت، جیسے کاموں میں مصروف رہنا اس بات کی علامت ہے کہ آنحضور ﷺ کے آباؤاجداد ...... اللہ تعالیٰ کے ہاں انتہائی نیک اور برگزیدہ بندے تھے اور آپ کے اجداد ان عظیم خدمات کی بجا آوری کی بنا پر...... یقیناً مومن تھے اور موحد تھے.

چنانچہ امت میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ آنحضور ﷺ کے تمام اجداد آپ کی تمام جدات اپنے زمانے کے بہترین لوگ تھے۔ ان کے باہمی تعلقات نکاح پر مبنی تھے، یہ لوگ غلط روی اور فسق وفجور سے دور تھے۔ یہ تمام مرد اور تمام خواتین اخلاقی اور نسبی اعتبار سے برگزیدہ اور عمدہ ترین لوگ تھے۔ اسی بنا پر علماء کی اکثریت انہیں مؤمن اور نجات یافتہ تصور کرتی ہے.

اس حوالے سے قرآن کریم اور نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ میں کچھ اشارے ایسے بھی ملتے ہیں، کہ جن کی بنا پر امت میں شروع سے ہی، یہ نظریہ چلا آتا ہے کہ آنحضور ﷺ کے نسب نامہ کے اس سلسلۃ الذہب میں شامل تمام لوگ مؤمن اور نجات یافتہ ہیں ...... جس کے دلائل کی تفصیل آئندہ آرہی ہے.

سب سے پہلی شخصیت جس نے یہ آواز بلند کی، وہ عبدالرحمٰن السہیلی (م ۵۰۸ھ/۱۱۱۴ء) شارح ''السیرۃ النبویۃ ...... لابن ہشام ...... کی ہے، جنہوں نے اپنی کتاب ''الروض الانف'' میں، امام ابوبکر البیہقی کے قول کو نقل کرنے کے بعد جو نبی اکرم ﷺ کے والدین اور اجداد کے متعلق دوسری رائے رکھتے تھے، حسب ذیل عبارت لکھی ہے:

> ولیس لنا ان نقول نحن هذا فی ابویه صلی الله علیه وسلم لقوله علیه السلام لا تؤذوا الاحیاء بسبب الاموات والله عز وجل یقول اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ(۵۸)
>
> اور ہمارے لیے یہ مناسب نہیں ہے، کہ ہم آنحضور ﷺ کے والدین کے بارے میں ایسی بات کہیں۔ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ زندوں کو مردوں کی بنا پر اذیت نہ دو، اور اللہ رب العزت فرماتے ہیں '' بے شک وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ اور اس کے

رسول کو اذیت دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان پر دنیا و آخرت میں
لعنت کی ہے۔

اس کے بعد علامہ السہیلی رحمہ اللہ نے حدیث احیاء کا ذکر کیا ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کو قیامت کے دن زندہ کرے گا اور انہیں اسلام لانے کی دعوت دی جائے گی، تو یہ لوگ اسلام قبول کر لیں گے۔

معروف امام اور فلسفی امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک تھا...... ان کی اس رائے کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اجداد ایمان اور توحید پر قائم تھے اور یہ کہ آذر جن کا قرآن مجید میں بطور مشرک ہونے کے ذکر آیا ہے، حضرت ابراہیم کے والد نہ تھے، بلکہ چچا تھے...... امام السہیلی رحمہ اللہ کے بعد بھی کئی لوگوں نے یہی مسلک اختیار کیا ہے، چنانچہ علماء نے اس موقف کو بیان کرنے کے لیے کئی عنوانات یا مسالک اختیار کیے گئے تھے، انہی مسالک کو علامہ جلال الدین السیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب **مسالک الحنفاء فی والدی المصطفی** میں جمع کیا ہے، السیوطی رحمہ اللہ کے مطابق اس بارے میں علماء نے حسب ذیل مسالک اپنائے ہیں۔

(الف) زمانہ فترت میں ہونا

بہت سے علمائے کرام کے نزدیک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین اور آپ کے اجداد اس لیے بھی اس بحث سے بالاتر ہیں کہ یہ بزرگ زمانہ فترت (دور انقطاع نبوت) میں پیدا ہوئے تھے اور ان بزرگوں کا بعثت نبوی سے پہلے انتقال ہو گیا تھا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اصول یہ ہے کہ وہ اس وقت تک کسی کو مبتلائے عذاب نہیں کرتا، جب تک کہ ان کے پاس اپنا رسول نہ بھیج دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (۵۹) — اور ہم (کسی کو) اس وقت تک عذاب نہیں دیتے، جب تک کہ ہم رسول نہ بھیج دیں۔

یہ دلیل سب سے پہلے شیخ الاسلام علامہ عبد الروف المناوی رحمہ اللہ (۹۵۲ھ/ ۱۰۳۱ھ) نے پیش کی، چنانچہ ایک مرتبہ ان سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے متعلق

سوال کیا گیا۔ جس پر ان کے اور سائل کے درمیان گرما گرم بحث ہوئی۔ سائل نے پوچھا کیا ان کا اسلام لانا ثابت ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ان کا زمانہ فترت میں انتقال ہو گیا تھا اور اس وقت انتقال کرنے والوں کے لیے کوئی سزا ہی نہیں ہے۔ (٦٠)

اسی طرح نامور محقق علامہ سبط ابن الجوزی رحمہ اللہ (م ٥٧٢ھ/٦٥٤ء) نے اپنی کتاب ''مراۃ الزمان'' میں علماء کی ایک جماعت کی طرف اسی قول کو منسوب کیا ہے۔

انہوں نے آنحضور ﷺ کے والدین کے زندہ کیے جانے کے متعلق حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ''ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُولًا اور آنحضور ﷺ کے والدین تک اسلام کی دعوت ہی نہیں پہنچی، (پھر) ان کا کیا گناہ ہے؟۔

اسی طرح علامہ ابی (ابو عبد اللہ محمد بن خلف ...... الوشتانی المالکی، صاحب اکمال المعلم لفوائد کتاب مسلم (م ٨٢٧ھ) نے اپنی کتاب شرح صحیح مسلم میں بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس مورمحدث اور محقق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ العسقلانی (م ٧٧٣-٨٥٢ھ) نے بھی لکھا ہے:

والظن بآبائه صلى الله عليه وسلم يعني الذي ماتوا قبل البعثة انهم يطيعون عند الامتحان اكراماً لهم لتقربهم عينه (٦١)

اور آنحضور ﷺ کے خاندانی بزرگوں، یعنی ان لوگوں کے بارے میں جو بعثت سے قبل انتقال کر گئے، گمان یہ ہے ان کا امتحان لیا جائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کریں گے۔ یہ سب کچھ ان کی تعظیم وتکریم کے لیے ہوگا اور تا کہ ان کے ذریعے آنحضور ﷺ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

علامہ السیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے ''الاصابہ'' میں دیکھا کہ حافظ ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''کئی طریقوں سے یہ روایت ہم تک پہنچی ہے کہ قیامت کے دن سٹھیا جانے والے بوڑھے اور ایسے لوگ جو زمانہ فترت میں انتقال کر گئے ہیں اور جو پیدائشی طور

بہرے، اندھے اور گونگے ہوں، یا جو شخص دیوانہ پیدا ہوا یا اس پر بلوغ سے پہلے دیوانگی طاری ہوگئی، یا اسی طرح کے دوسرے لوگوں کا اتمام حجت کے لیے امتحان لیا جائے گا (اور اگر وہ یہ کہہ دیں گے کہ) اگر میں سمجھ دار ہوتا، یا مجھے نصیحت کی جاتی تو میں بالضرور ایمان لے آتا تو ان کے سامنے جہنم لائی جائے گی اور انہیں کہا جائے گا اس (جہنم) میں داخل ہو جاؤ۔ پھر جو کوئی اس میں داخل ہو گیا تو وہ اس کے لیے ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جائے گی اور جو کوئی اس میں (خوشی سے) داخل نہ ہوگا اسے جبراً داخل کیا جائے گا''۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کے تمام طرق کو ایک جزو (رسالے) میں جمع کر دیا ہے، اس کے بعد لکھتے ہیں:

''اور ہم امید رکھتے ہیں کہ جناب عبد المطلب اور ان کے خاندان کے دوسرے لوگ اس میں (امتحان کے وقت) خوشی سے داخل ہونے والوں میں شامل ہوں گے، سوائے ابو طالب کے، اس لیے کہ انہوں نے بعثت نبوی کا زمانہ پایا ہے، مگر ایمان قبول نہیں کیا اور (صحیح) حدیث سے ثابت ہے کہ ابو طالب ہلکی آگ (ضحضاح) میں ہوں گے (۶۲)۔

علامہ السیوطی رحمہ اللہ نے اس مسلک کے حق میں چھ قرآنی آیات اور سات احادیث نبویہ سے بھی استدلال کیا ہے، جن سے زمانۂ فترت کے لوگوں کے بارے میں ملامت ہوتی ہے کہ قیامت کے دن ان کا امتحان لیا جائے گا اور وہ امتحان کے بغیر جہنم کے سزاوار ہوں گے اور نہ جنت کے، جیسا کہ قرآن حکیم میں بھی صراحت ہے کہ اللہ تعالیٰ جب تک کسی قوم پر اتمام حجت نہ فرما لیں گے اس وقت تک اسے عذاب نہ دیں گے (۶۲)۔

علامہ السیوطی رحمہ اللہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا یہ مسلک صرف ان لوگوں کے بارے میں ہے جن تک دین کی دعوت نہیں پہنچی اور جو لوگ ''دعوت دین'' ملنے کے باوجود اس سے کنارہ کش رہے، ان کا حکم اس سے مختلف ہوگا (۶۳)۔

(ب) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کا ملت حنیفیہ کا حامل ہونا

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین ملت حنیفیہ کے حامل اور اس پر عامل تھے، جیسے کہ کتب تاریخ میں زید بن عمرو بن نفیل اور ورقہ بن نوفل کے

بارے میں صراحت سے ذکر آتا ہے، کہ وہ موحد تھے۔ مفسرین میں یہ مسلک علامہ فخر الدین الرازی رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار فرمایا، چنانچہ وہ اپنی کتاب ''اسرار التنزیل'' میں لکھتے ہیں:

کہا جاتا ہے کہ آذر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد نہ تھا، بلکہ ان کا چچا تھا'' پھر اس پر انہوں نے متعدد دلائل دیئے ہیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلَّذِیْ یَرَاکَ حِیْنَ تَقُوْمُ ٥ وَتَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیْنَ (وہ ذات جو تجھے اس وقت دیکھتی ہے جب تو کھڑا ہوتا ہے اور سجدہ گزاروں میں)(٦٣)

بعد ازاں کچھ علماء کے حوالے سے لکھا ہے، کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا نور مبارک ایک سجدہ گزار سے دوسرے سجدہ گزار میں منتقل ہوتا رہا، لہٰذا یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے تمام اجداد مؤمن تھے، جس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کافر نہ تھے، جبکہ آذر تو ان کا چچا تھا، ماسوا اس کے کہ آیت مبارکہ وَتَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیْنَ کو دوسری تاویلات پر محمول کیا جائے''۔

اس کے بعد امام رازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

اور اس بات کی دلیل کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد بت پرست نہ تھے نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد مبارک ہے، آپ نے فرمایا:

ولم ازل انقل من اصلاب الطاھرین الی ارحام الطاھرات(٦٤)

اور میں پاکباز مردوں سے، پاک دامن عورتوں کی رحموں کی طرف منتقل ہوتا رہا۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ﴾ (بے شک مشرک پلید ہیں۔)

اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آنحضور ﷺ کے بزرگوں میں سے کوئی بھی مشرک نہ تھا(٦٥)۔ اس مسلک کی تائید مین علامہ جلال الدین السیوطی نے دو مقدمات قائم فرمائے ہیں:

اول: یہ کہ نبی اکرم ﷺ کے تمام جد امجد، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جناب عبداللہ تک اپنے زمانے میں سب سے بہتر اور سب سے افضل اشخاص تھے۔

دوم: یہ کہ کئی روایات اور آثار سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی اکرم ﷺ کی بعثت مبارکہ تک کوئی زمانہ بھی ایسے لوگوں سے خالی نہیں رہا جو فطرت اصلیہ پر قائم تھے اور جو اللہ تعالیٰ کو ایک مانتے، ایک سمجھتے اور اپنے پروردگار کے سامنے نماز ادا کرتے تھے۔ انہی لوگوں کی وجہ سے یہ زمین تباہی سے محفوظ رہی اور اگر ایسے لوگ موجود نہ ہوتے، تو یہ زمین اور جو لوگ اس کی پشت پر موجود ہیں، کبھی کے فنا ہو چکے ہوتے۔

ان دونوں مقدمات کے ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بزرگوں میں سے کوئی بھی شخص مشرک نہ تھا(٦٦)۔

بعد ازاں علامہ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ان دونوں مقدمات کے حق میں بہت سی روایات سے استدلال کیا ہے، جن میں سے بیشتر احادیث اور آثار کا تذکرہ سابقہ اوراق میں آ چکا ہے اور کچھ تفصیل آئندہ بھی آ رہی ہے۔ اسی طرح دوسرے مقدمہ کے ضمن میں بھی علامہ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف روایات اور آثار کا تذکرہ کیا ہے، مثال کے طور پر ابتدا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے، کہ انہوں نے فرمایا:

لم یزل علی وجه الدهر فی الارض سبعة مسلمون فصاعدا فلو لا ذلک لهلکت الارض ومن علیها ...... رواه عبد الرزاق فی المصنف(٦٧)	روئے زمین پر ہر زمانے میں سات یا اس سے زیادہ لوگ ہمیشہ مسلمان رہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو زمین اور اس کے رہنے والے تمام لوگ ہلاک کر دیئے جاتے۔

(ج) آنحضور ﷺ کے والدین کے متعلق منفی روایات کا تجزیہ

آنحضور ﷺ کے والدین کے "ناجی" (نجات یافتہ) ہونے کے حوالے سے، اب تک جو بحث ہوئی، وہ (مثبت) پہلو سے تھی، جبکہ اس کا دوسرا پہلو بھی اہمیت کے لحاظ سے کم نہیں ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس موقف کی مخالفت میں بہت سی احادیث اور روایات نقل کی جاتی ہیں، ان روایات پر علامہ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ سے

لے کر قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ تک ہر دور کے علماء اور محدثین نے بحث کی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ علامہ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں ان روایات کے حوالے سے، ان کے فکری مخالفین کا شور شرابا بہت بڑھ گیا تھا، اسی لیے علامہ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

المجادلون فی هذا الزمان کثیر خصوصاً فی هذه المسئلة و اکثرهم لیس لهم معرفة بطریق الاستدلال فالکلام معهم ضائع (۶۸)

ہمارے اس زمانے میں، خصوصاً اس مسئلے میں، بحث کرنے والے لوگ بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے بیشتر افراد کو طریقہ ہائے استدلال کا بھی علم نہیں ہے، لہٰذا ان کے ساتھ بحث میں الجھنا ہی فضول ہے۔

تاہم اہل علم کے سامنے اتمام حجت کے لیے علامہ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے ساتھ نصب میدان جدلی (مناظرانہ میدان) کے عنوان سے حسب ذیل طریقے پر استدلال کیا ہے:

''ہمارے مخالفین میں سے زیادہ تر لوگ کہتے ہیں کہ صحیح مسلم میں صحیح حدیث سے تمہارے اس دعوے کے برخلاف ثابت ہوتا ہے۔

اگر تو کہنے والا ہمارا ہم مسلک، یعنی شافعی المسلک ہو، تو میں اس سے کہوں گا کہ صحیح مسلم میں، صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں پڑھی اور تم بسم اللہ پڑھے بغیر نماز کو درست نہیں مانتے اور صحیحین (بخاری و مسلم) میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''امام اس لیے بنایا جاتا ہے کہ تم اس کی اقتدا کرو، لہٰذا تم اس سے اختلاف نہ کرو، اگر وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو، مگر ''جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہتا ہے، تو تم اسی کی طرح سمع اللہ لمن حمدہ کہتے ہو (اقتدا نہیں کرتے) اور جب وہ کسی عذر کی بنا پر بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے تو تم ان کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے ہو، بیٹھ کر نہیں پڑھتے (اس طرح امام کی مخالفت کرتے ہو) ..... اسی طرح صحیحین کی حدیث تیمّم میں ہے ''تیرے لیے یہ بات کافی ہے کہ تو اپنے ہاتھ سے اس طرح کرے'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ ایک مرتبہ زمین پر مارا اور بائیں ہاتھ سے

دائیں ہاتھ کا اور دونوں کی پشت اور چہرے کا مسح کیا، جب کہ تم تیمم میں ایک مرتبہ ہاتھ مارنے کو کافی نہیں سمجھتے اور نہ ہی ہاتھوں کے گٹوں تک مسح کو کافی خیال کرتے ہو، سو تم نے ان احادیث کی، جو صحیحین میں ہیں یا دونوں میں سے ایک میں ہیں، کیوں مخالفت کی؟ پھر اگر اس کے پاس ذرہ برابر بھی علم ہو، تو وہ کہہ اٹھے گا کہ "ہمارے پاس ایسی دلیلیں ہیں" جو ان کے خلاف اور ان پر مقدم ہیں (لہٰذا ہم ان حدیثوں پر عمل نہیں کرتے) تو میں اس کے جواب میں کہوں گا بجا۔ زیر بحث مسئلہ بھی ایسا ہی ہے اس پر اسی طریقے سے حجت قائم کی جاتی ہے، اس لیے کہ یہ دلیل اور اس جیسی اور دلیلوں کو لازم کرنے والی ہے۔

اور اگر ہمارے ساتھ مباحثہ کرنے والا مالکی المذہب ہو، تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے: صحیحین میں ہے، کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "**البیعان بالخیار ما لم یتفرقا**" (بیع کرنے والے، جب تک ایک دوسرے سے الگ نہ ہو جائیں، انہیں بیع فسخ کرنے کا اختیار رہتا ہے) اور تم لوگ خیارِ مجلس کو درست نہیں سمجھتے۔ اسی طرح صحیح مسلم میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور اپنے سارے سر کا مسح نہیں کیا، مگر تم لوگ وضو میں پورے سر کا مسح لازم قرار دیتے ہو، تو تم نے صحیح مسلم میں وارد شدہ صحیح حدیث کی مخالفت کیوں کی؟ اس پر وہ کہے گا کہ اس کے بالمقابل ایسی دلیلیں ہیں جو ان کی معارض اور ان پر مقدم ہیں، تو ہم بھی یہاں کہتے ہیں کہ زیر بحث مسئلہ بھی اسی طرح ہے۔

اور اگر ہمارا مخالف حنفی المسلک ہو، تو ہم اس سے کہیں گے کہ صحیح حدیث میں ہے، کہ جب کتا تم میں سے کسی کے برتن میں منہ ڈال دے، تو تم اسے سات مرتبہ دھوؤ" اور تم لوگ کتے کی نجاست میں سات بار دھونے کو ضروری نہیں سمجھتے اور صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس شخص کی نماز درست نہیں ہوتی، جو نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے" مگر تم لوگ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز کو صحیح قرار دیتے ہو۔ اسی طرح صحیحین میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اور پھر تو اپنا سر اٹھا، یہاں تک کہ تو بالکل سیدھا ہو جائے" مگر تم لوگ اعتدال میں طمانیت کے بغیر نماز کو صحیح قرار دیتے ہو اور صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ "جب پانی دو قلوں (بڑے مٹکوں) تک پہنچ جائے تو وہ گندگی نہیں اٹھاتا" مگر تم لوگ قلتین کا اعتبار نہیں کرتے اور صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدبر غلام کو

فروخت کیا'' مگر تم لوگ مدبر کی بیع کو صحیح نہیں سمجھتے، ان باتوں کے جواب میں وہ کہے گا کہ ہمارے پاس ایسی دلیلیں ہیں جو ان کی معارض ہیں، جن کی بنا پر ہم نے انہیں ان پر مقدم کر دیا تو ہم بھی یہاں یہی کہیں گے۔

اور اگر ہمارا مخالف حنبلی المسلک ہے، تو ہم اس سے کہیں گے کہ صحیحین میں ہے، کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے شک والے دن روزہ رکھا، اس نے ابوالقاسم ﷺ کی نافرمانی کی'' اور صحیحین میں ہے کہ ''رمضان المبارک سے پہلے ایک یا دو دن روزے (مت) رکھو'' مگر تم لوگ شک والے دن میں روزہ رکھنے کے قائل ہو تو تم نے صحیحین کی حدیث کی مخالفت کیوں کی؟ تو وہ کہے گا کہ اس کے مقابلے میں ہمارے پاس ایسی دلیلیں ہیں جو ان کی معارض ہیں، لہٰذا ہم نے انہیں ان پر مقدم کر دیا، تو ہم بھی یہی کہیں گے کہ یہاں بھی یہی صورت ہے۔

اور اگر بحث کرنے والا شخص ایسا ہو، جو محدث تو ہو، مگر فقیہ نہ ہو، تو ہم کہیں گے کہ ''قدماء کہہ گئے ہیں، کہ فقہ کے بغیر حدیث بیان کرنے والا ایسے ہے جیسے کوئی عطار جو طبیب نہ ہو، کہ اس کے پاس تمام ادویات تو موجود ہیں، مگر اسے یہ علم نہیں ہے کہ اس کی کونسی دوا کس مرض کے لیے بہتر ہے اور فقیہ، جو حدیث نہ جانتا ہو ایسے ہے کہ جیسے کوئی طبیب جو عطار نہ ہو کہ اسے یہ علم تو ہو کہ کونسی دوا کس مرض میں کیا فائدہ دیتی ہے، مگر اس کے پاس ادویہ ہی موجود نہ ہوں''(۶۸)۔

اس طرح علامہ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ہر موقف ومسلک کے حامل لوگوں پر اتمام حجت کیا ہے۔

(د) آنحضور ﷺ کے والدین کو زندہ کرنے اور ان کے ایمان لانے کا مسلک:

اس سلسلے میں تیسرا مسلک یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے والدین کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کیا اور وہ آنحضور ﷺ پر ایمان لائے (اور پھر اسی وقت ان کا انتقال ہو گیا)۔

بقول علامہ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ یہ مسلک بہت سے علماء نے اختیار فرمایا، جن میں ابن شاہین، حافظ ابوبکر الخطیب البغدادی، علامہ عبدالرحمان السہیلی، القرطبی، محب الطبری اور

علامہ ناصرالدین بن المنیر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس بارے میں محدثین اور سیرت نگاروں نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے اسے خطیب البغدادی (السابق واللاحق) الدارقطنی اور ابن عساکر نے "غرائب مالک" میں، ایک ضعیف سند کے ساتھ، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔

اس "احیائے والدین نبوی" والی حدیث کو علامہ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے، محدثین کے اتفاق کے ساتھ ضعیف، بلکہ موضوع قرار دیا ہے، مگر انہوں نے لکھا ہے، کہ ان کے خیال میں یہ روایت موضوع نہیں، بلکہ ضعیف ہے اور یہ کہ انہوں نے اس حدیث کی توضیح وتشریح کے لیے ایک مستقل جزو (رسالہ) لکھا ہے (۷۰)۔

نامور محدث اور مفسر علامہ القرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حدیث "احیاء، اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے لیے استغفار کرنے کی ممانعت پر مشتمل حدیث کے مابین کوئی تعارض نہیں ہے، اس لیے کہ آپ کے والدین کے احیاء کا واقعہ بعد میں پیش آیا۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مطابق، احیاء کا واقعہ حجۃ الوداع کا ہے، اسی لیے ابن شاہین نے اسے سابقہ احادیث وروایات کے لیے ناسخ قرار دیا ہے۔

علامہ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے احیاء کا واقعہ شرعاً اور عقلاً ناممکن نہیں ہے، اس لیے کہ قرآن حکیم میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں (۷۱)۔

تاہم اس بارے میں قول فیصل یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کو زندہ کرنے کے بیان پر مشتمل جتنی بھی روایات ہیں، جن کا تذکرہ علامہ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی اتباع میں قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب "تقدیس والدی المصطفیٰ" میں بھی کیا ہے، وہ تمام کی تمام ضعیف اور انتہائی کمزور ہیں، قریباً تمام کی اسناد میں کوئی نہ کوئی کمزوری اور خرابی موجود ہے، اسی لیے ان روایات کو کسی بھی مستند مجموعہ حدیث میں روایت نہیں کیا گیا، البتہ ان عنوان پر لکھنے والے علماء نے ان روایات سے تائید وتوثیق کا کام ضرور لیا ہے، لیکن ہمارے خیال میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کی نجات کا مسئلہ، اس

قسم کی کمزور یا ضعیف روایات کا محتاج نہیں ہے، اس کے برعکس یہ مسئلہ قرآن وسنہ کی بعض قطعی نصوص سے واضح ہو جاتا ہے۔

(ھ) علامہ الآلوسی کا موقف

سب سے آخر میں نامور محقق اور خاتم المفسرین، علامہ الآلوسی رحمہ اللہ کا موقف پیش کرنا مناسب ہوگا کہ انہوں نے ایسے شخص کے متعلق جو نبی اکرم ﷺ کے ''والدین'' کے بارے میں کفر کا عقیدہ رکھتا ہے، کفر کا فتویٰ دیا ہے۔ علامہ الآلوسی، مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

واستدل بالآية على ايمان ابويه صلى الله عليه وسلم كما ذهب اليه كثير من اهل السنة وانا اخشى الكفر على من يقول فيهما رضى الله عنهما على رغم انف على القارى واضرابه بضد ذلك الا انى لا اقول لحجية الآية على هذا المطلب. (۷۲)

اور اس آیت سے نبی اکرم ﷺ کے والدین کے ایمان پر استدلال کیا گیا ہے، جیسا کہ بہت سے جلیل القدر ائمہ اہل سنت کا یہی مسلک ہے اور میں ملا علی قاری اور ان جیسے لوگوں کے برخلاف یہ کہتا ہوں کہ مجھے اس شخص کے متعلق کفر کا اندیشہ ہے جو آنحضور ﷺ کے والدین کے بارے میں کوئی ناپسندیدہ بات (کفر وغیرہ کی) کہے۔ البتہ میں اس آیت کی، اس مضمون پر حجیت کا دعویٰ بھی نہیں کرتا۔

قاضی محمد ثناء اللہ پتی کا موقف ونظریہ:

قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) اپنے دور کے نمایاں محدث ومفسر ہی نہیں، بلکہ اپنے زمانے میں تحریک نشاۃ ثانیہ کے بہت بڑے رہنما اور قائد بھی تھے۔

انہوں نے چالیس کے قریب کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں سے ۱۰ جلدوں پر مشتمل تفسیر (تفسیر مظہری) سمیت حدیث، فقہ، سیرت اور تصوف وغیرہ کے موضوعات پر بڑی اہم کتب شامل ہیں (۷۳)۔

قاضی صاحب رحمہ اللہ نے دوسرے موضوعات کے علاوہ خاندان نبوت سے متعلق کئی رسالے تصنیف فرمائے جن میں زیر بحث رسالہ بھی شامل ہے(۷۴)۔

قاضی صاحب نے اپنی تفسیر مظہری میں دو مقامات پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین اور بزرگوں کے ایمان کا ذکر کیا ہے اور اپنے اس رسالے کا حوالہ دیا ہے جو انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین اور بزرگوں کے اثبات میں تحریر کیا ہے۔(۷۵) اس طرح قاضی صاحب کا شمار بھی ان بزرگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین اور بزرگوں کے مومن ہونے کے نظریئے کی پُر زور وکالت کی ہے۔

قاضی صاحب کے یہ رسالے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وشمائل سے لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندانی بزرگوں اور آپ کے خاندان کے پاکیزہ تذکرے سے معطر ہیں، جس سے دراصل وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ جب تک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بزرگوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور آپ کے خاندان کے لوگوں سے محبت نہ رکھی جائے اور ان کی انتہائی درجے میں تعظیم وتکریم نہ کی جائے، اس وقت بندہ کے ایمان کی تکمیل نہیں ہوسکتی، چنانچہ وہ اپنے اس رسالے کی تصنیف کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وبعد فهذه رسالة في اثبات ایمان آبائه صلى الله عليه وسلم(۷۶) — یہ کتابچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء واجداد کے ایمان کے اثبات پر مشتمل ہے۔

اور اس رسالے میں انہوں نے علامہ السیوطی کے موقف اور استدلال کو دہراتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بزرگوں کے مومن ہونے کا نظریہ پیش کیا ہے۔

تجزیہ:

جہاں تک زیر بحث مسئلے میں، مذکورہ مسالک کے تجزیے کا تعلق ہے، تو یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس بارے میں درست ترین مسلک یہ ہے کہ اول تو سکوت (خاموشی) اختیار کی جائے، اس لیے کہ اس بارے میں جمہور کا یہی مسلک ہے اور پھر اس لیے بھی کہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے، جس کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے اور ایسے

مسائل میں قرآن حکیم کا بھی یہی حکم ہے کہ زبان بند رکھی جائے۔

اور اگر کبھی زبان کھولنا ہی پڑے تو پھر آنحضور ﷺ کے والدین کے صاحب ایمان اور نجات یافتہ ہونے کا نظریہ اختیار کیا جائے اس لیے کہ اسی میں بہتری اور بھلائی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ بزرگ زمانہ فترت میں گزرے ہیں اور ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن حکیم میں صراحت ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں عذاب نہیں دے گا، اس کے بعد کیا صورت ہوگی، اس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

حوالہ جات وحواشی

(۱) البخاری، کتاب الوحی، باب ٦، حدیث ۷، ا/ ۳۱۔

(۲) ایضاً۔

(۳) البخاری، ٦/ ٥٦٦، کتاب المناقب (٦١) باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ...... حدیث ۳۵۵۷۔

(۴) مسلم، ۴/ ۱۷۸۲، کتاب الفضائل (۴۳) باب فضل نسب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وتسلیم الحجر علیہ قبل النبوہ (۱) حدیث ا/ ۲۲۷٦۔

(۵) مسلم، ۴/ ۱۷۸۲، باب ۲، حدیث ۳/ ۲۲۷۸۔

(٦) احمد بن حنبل، مسند ا/ ۲۱۰، الترمذی، ۵/ ۵۸۴، کتاب المناقب، باب (۱) فضل النبی صلی اللہ علیہ وسلم، الحدیث ۳٦۰۷ و (۳٦۰۸)۔

(۷) احمد، ۴/ ۱۲۷-۱۲۸؛ الہیثمی، کشف الاستار (ا/ ۱۱۳) کتاب علامات النبوۃ، حدیث ۲۳٦۵، البغوی، مصابیح السنۃ، مکتبہ الاثریہ، ۴/ ۳۸۔

(۸) احمد بن حنبل، مسند، ۴/ ۱۲۷_۱۲۸، الہیثمی، کشف الاستار، ا/ ۱۱۲، کتاب علامات النبوۃ، حدیث: ۲۳٦۵

(۹) ابن سعد، ا/ ۲۱

(۱۰) ابن ہشام، السیرۃ، ا/ ۲، حاشیہ ۲

(۱۱) الاستیعاب فی معرفۃ الانساب، ا/ ۱۴۔

(۱۲) ایضاً۔

(۱۳) دیکھیے ابن ہشام، السیرۃ، طبع مصطفیٰ السقاء، وغیرہ ۱/۱۔۲؛ ابن سعد، الطبقات، ۱/۵۶؛ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ، ص ۷۵؛ الاستیعاب ۱/۱۳؛ السمعانی؛ کتاب الانساب، مجلس دائرہ المعارف، حیدرآباد، دکن ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء، ص ۱۲۔۱۳

(۱۴) ابن ہشام، ۱/۲۔

(۱۵) الاستیعاب، ۱/۱۳۔

(۱۶) الاستیعاب، ۱/۳۱۔

(۱۷) الاستیعاب، ۱/۱۳۔

(۱۸) السمعانی، ص ۱۴۔

(۱۹) الاستیعاب، ۱/۱۴۔

(۲۰) ایضاً۔

(۲۱) الشامی سبل الہدی والرشاد، ۱/۲۸۰۔

(۲۲) السویدی، سبائک الذہب، ص ۵۹۔

(۲۳) السمعانی، ص ۲۴۔۲۵

(۲۴) البلاذری، انساب الاشراف، ۱/۵۲۔

(۲۵) نسب قریش، ص ۳۔۴

(۲۶) تکوین، ۱۱/۳۶۔

(۲۷) ایضاً، ۱۶/۱۶۔

(۲۸) ایضاً، ۲۱/۵۔

(۲۹) ابن ہشام ...... ۱/۳۔

(۳۰) ایضاً۔

(۳۱) السمعانی، الانساب، ۱/۲۵۔

(۳۲) الزبیری، نسب قریش، ص ۴۔

(۳۳) ابن ہشام، ۱/۴

(۳۴) ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مقالہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم در اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۱۹/۴۔

(۳۵) ابن سعد، ۱/ ۲۸۔

(۳۶) ابن ہشام، ۱/۳-۴۔

(۳۷) السمعانی، الانساب، ص: ۱۴۔

(۳۸) البقرۃ، ۲/۱۲۵۔

(۳۹) التوبہ، ۹/۱۷۔

(۴۰) ابن سعد ۱/۷۲۔

(۴۱) السمعانی، الانساب، ص ۱۸۔

(۴۲) البلاذری، انساب الاشراف، ۱/۵۲؛ ابن سعد، الطبقات، ۱/۷۳۔

(۴۳) السہیلی، ۱/۲۸، ان کنوؤں کی تفصیل ابن ہشام، ۱/۱۴۷-۱۵۰ میں دی گئی ہے۔

(۴۴) ابن ہشام، ۱/۱۴۷۔

(۴۵) السویدی، سبائک الذہب، ص ۳۶۳۔

(۴۶) ابن سعد، ۱/۷۲۔

(۴۷) ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ؛ ابن سعد، الطبقات، ۱/ ۷۵-۷۶۔

(۴۸) دیکھئے کتب تفسیر، بذیل ایلاف، ۱۰۶/۱-۲۔

(۴۹) ابن ہشام، السیرۃ، ۱/ ۵۰-۵۱...... وہاں یہ دعا تفصیلاً دی گئی ہے۔

(۵۰) ابن ہشام، ۱/ ۱۴۶-۱۴۷۔

(۵۱) البقرۃ، ۲/ ۱۲۸۔

(۵۲) ابن ہشام، ۱/۱۳۳-۱۳۴۔

(۵۳) ابن ہشام، ۱/۱۳۴۔

(۵۴) ایضاً۔

(۵۵) السہیلی، الروض الانف، ۲/ ۱۸۶، بحوالہ الرازی، تفسیر، بذیل ۳۳ (الاحزاب)

(۵۶) ایضاً۔

(۵۷) ایضاً۔

(۵۸) قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی، تقدیس والدین مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، طبع و ترجمہ محمود الحسن عارف مرکز ادب اسلامی، لاہور ۲۰۰۱، ص ۳۳، بحوالہ السہیلی

(۵۹) القرآن الکریم، بنی اسرائیل، ۱۵/۱۵

(٦٠) جلال الدین السیوطی، مسالک الحنفاء (عربی) مطبوعہ چشتی کتب خانہ فیصل آباد، ١٩٨٦ء، مع اردو ترجمہ، ص ١

(٦١) ایضاً، ص ١

(٦٢) ایضاً، ص ٢، ٣

(٦٣) التوبہ، ٢٦/ ٢٠٨۔٢٠٩

(٦٤) مسالک، ص ٦

(٦٥) ایضاً، ص ٧

(٦٦) ایضاً

(٦٧) ایضاً، ص ٧۔٨

(٦٨) ایضاً، ص ٢٥

(٦٩) ایضاً، ص ٣٥۔٣٦

(٧٠) ایضاً۔

(٧١) ایضاً، ص ٣٦، ٣٧۔

(٧٢) الآلوسی، تفسیر روح المعانی، ١٩/ ٣٨

(٧٣) قاضی صاحب کی ولادت ١٧٣٠ کے نواح میں اور وفات ١٢٢٥ھ/ ١٨١٠ء میں ہوئی، ان کے حالات زندگی کے لیے دیکھئے، ہماری کتاب تذکرہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی، مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ ٢۔ کلب روڈ، لاہور

(٧٤) یہ رسالہ راقم الحروف نے اردو ترجمہ کے ساتھ لاہور سے ٢٠٠١ء میں شائع کر دیا ہے

(٧٥) تفسیر مظہری، تفسیر سورۃ البقرہ، آیت ١١٩، وتفسیر سورۃ التوبہ، آیت ١١٣

(٧٦) تقدیس والدین مصطفی، عربی متن، ص ١، ٢۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

باب 1

جزیرۂ عرب' اہل عرب اور ان کی اخلاقی' مذہبی اور علمی حالت

نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے اجداد نے اپنی اپنی زندگیاں جس سرزمین پر بسر کیں۔ یہ سرزمین ''عرب'' کہلاتی ہے۔ اجداد نبوی کے حالات پر گفتگو کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''عرب'' کی سرزمین اور دوسرے متعلقہ حالات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اس باب میں درج ذیل موضوعات پر گفتگو کی جائے گی۔

① جزیرۂ عرب اور اس کا محل وقوع

② قبل از اسلام کا جاہلی معاشرہ

③ مذہبی حالت

④ علمی حالت

⑤ اخلاقی حالت، تفصیل حسب ذیل ہے۔

1 جزیرۂ عرب اور اس کا محل وقوع:

وجہ تسمیہ: اس کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے' اس ضمن میں حسب ذیل آراء منقول ہیں:

① عرب' بمعنی فصاحت و بلاغت: چونکہ ''اہل عرب'' خود کو زبان آوری اور فصاحت و بلاغت میں یکتا اور دوسرے لوگوں کو عجمی (ژولیدہ بیان) سمجھتے تھے' اس لیے اس علاقے کا نام ''عرب'' پڑ گیا۔

② عرب دراصل عربہ تھا جس کے معنی سامی زبانوں میں دشت اور صحراء کے ہیں' چونکہ ''جزیرۂ عرب'' کا بیشتر علاقہ صحرائی ہے اس لیے اس کا نام ''عرب'' پڑ گیا۔

③ لغت میں ''عرابہ'' کے معنی ''گندم گوں'' ہونے کے بھی آتے ہیں' چونکہ ان لوگوں کا رنگ ''گندم گوں'' ہوتا ہے' اس لیے یہ علاقہ ''عرب'' یعنی ''گندم گوں'' کہلانے لگا.

④ یعرب بن قحطان سے نسبت: یعرب بن قحطان قحطانی خاندن کے جد اعلیٰ ہیں' عربوں کا خیال تھا کہ یہی بزرگ عربی زبان کے اصل بانی ہیں' جیسا کہ حضرت حسانؓ بن ثابت فرماتے ہیں:

تعلمتم من منطق الشیخ یعرب ابناً فصرتم معربین ذوی نفر

(تم نے ہمارے بزرگوار باپ ''یعرب'' سے بات کرنا سیکھی' تب جا کر تمہاری زبان درست ہوئی اور تم میں جماعتی نظام پیدا ہوا.)

2___ محل وقوع:

عرب کے حدود اربعہ یہ ہیں:

مغرب: بحیرۂ احمر

مشرق: خلیج فارس، بحیرۂ عرب اور خلیج عمان

جنوب: بحر ہند

شمال: کی حدود ہمیشہ مختلف فیہ رہی ہیں' بعض محققین اسے حلب اور فرات تک وسعت دیتے ہیں.(۲)

اس کا رقبہ: شمال مغرب سے جنوب مشرق کی طرف کا فاصلہ ۲۲۰۰ کلومیٹر اور عرض تقریباً ۱۲۰۰ کلومیٹر ہے۔ اس کے جزیرۂ نما کی شکل با قاعدہ ''چوکورسی'' ہے...... جس کے توازن میں عمان' جو ایک آگے کو نکلا ہوا خطہ ہے' خلل انداز ہوتا ہے' جو ایرانی ساحل کے بہت قریب پہنچ جاتا ہے۔ ۱۲ء۴۰ء۴۴ کے درمیان عرض شمالی اور ۳۲ء۳۰ء۶ کے درمیان مشرقی طول البلد میں واقع ہے.(۳)

ملک کا بڑا حصہ ریگستانی ہے' پہاڑوں کا سلسلہ تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ سب سے بڑا سلسلۂ کوہ ''جبل السراۃ'' ہے جو یمن سے شروع ہو کر شمال میں شام تک چلا گیا ہے.

3___ زمین اور آب و ہوا:

عرب کی زمین کا زیادہ تر حصہ صحرائی اور ریگستانی ہے۔ جا بجا خشک اور کالے سیاہ پہاڑ ہیں۔ صحرا بھی لق ودق بیابان ہیں۔ سبزہ اور ہریالی بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ بادصرصر کے تند و تیز طوفان اپنے ساتھ گرم بخارات لاتے ہیں۔ ریگستانوں میں ریت کے تودے ادھر سے ادھر پانی کی سرکش موجوں کی طرح لہراتے ہیں۔ پانی کی قلت ہی نہیں' شدید قحط ہے۔ اس کے ساتھ جلانے والی لکڑی کا فقدان الگ مسئلہ ہے' گرمیوں میں آفتاب کی شعاعیں سیدھی اور تیز پڑتی ہیں۔ خط سرطان مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ' الخرج اور الافلاج کے ضلعوں اور مسقط اور راس الحدید کے درمیان عرب کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے' جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس ملک کے بیشتر حصوں کی آب و ہوا بالعموم معتدل رہتی ہے' بلکہ جنوب میں' جہاں جزیرہ نما کا سرا ۱۲ عرض بلد شمالی کے قریب پہنچ جاتا ہے' زیادہ تر علاقے کی بلندی ایسی ہے کہ وہ سخت گرمی سے محفوظ رہتا ہے' صرف اس نشیبی علاقے کی، جو بحیرۂ احمر' خلیج عدن اور بحیرۂ عرب کے بعض حصوں کے قریب واقع ہے' آب و ہوا معتدل نہیں ہے' بلکہ نیم استوائی ہے۔ موسم گرما کی حرارت سارے جزیرہ نما میں بہت شدید ہوتی ہے اور گرم ترین مقامات میں گرمی ۵۰ درجے سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتی ہے۔ اندرون ملک کے بیشتر حصے کی خشکی وہاں کی گرمی کو قابل برداشت بنا دیتی ہے' لیکن ساحلی علاقوں میں یہ گرمی مضمحل کر دیتی ہے۔ (۴)

خطہ عرب میں قابل کاشت زمین ویسے ہی تھوڑی ہے' مگر اس پر پانی کی قلت مستزاد ہے۔ جو پانی اور اونچے اور بلند پہاڑوں کی چوٹیوں سے بہہ کر آتا ہے اسے پیاسی زمین فوراً جذب کر لیتی ہے' بقیہ پانی سے لوگ اور جانور سیراب ہوتے ہیں۔ کسی کسی جگہ سخت جان کھجوریں اور ببولوں کے جھنڈ شبنم کے قطروں کے طفیل اپنی موجودگی کا ثبوت ضرور دیتے ہیں۔ گاہے بگاہے مینہ برستا ہے تو اس کو پانی کے حوضوں اور نالیوں میں محفوظ کر لیا جاتا ہے۔

چنانچہ الربع الخالی کے بعض علاقوں میں دس دس سال تک پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں برستا' قدیم زمانے میں کسی جگہ کنوؤں اور چشموں کا پایا جانا ایک مخفی خزانہ پانے کے مترادف تھا.

لیکن اب حالات بدل گئے ہیں' جدید سائنسی ترقی نے اس علاقے کی بہت سی محرومیوں کا مداوا کر دیا ہے.

قدرت نے اسی علاقے میں' جسے عرب ''ریگستان'' کہہ کر' نظر انداز کرتے تھے' سیال سونے (تیل) کے دریا بہا دیئے ہیں۔ روپے اور دولت کی ریل پیل نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں کو متاثر کیا ہے' وہاں کافی حد تک پانی اور سبزے کی قلت کا مسئلہ بھی حل کر لیا گیا ہے۔ سمندروں کا پانی مصنوعی عمل (تحلیہ) کے ذریعے' پینے اور آب پاشی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے اور عرب کے بہت سے حصوں میں بڑی تیزی سے قابل کاشت رقبے میں اضافہ ہو رہا ہے۔ خود سعودی عرب زرعی اجناس میں خود کفالت کی منزل حاصل کر چکا ہے.

پھر جہاں محنت و مشقت اور تکلیف زیادہ ہو وہاں تھوڑے آرام کی بھی قدر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل عرب کو سایہ دار مقامات' ٹھنڈے اور میٹھے چشموں کی سرگرمی سے تلاش رہتی تھی' جہاں یہ نعمتیں میسر آ جاتیں وہیں ان کا مسکن بن جاتا۔ وہ وہاں اس وقت تک مقیم رہتے جب تک یہ نعمتیں ان کا ساتھ دیتیں اور جب پانی کے چشموں کا ذخیرہ ختم ہو جاتا' یا جانوروں کے لیے سبزے کی قلت پیدا ہو جاتی تو وہ وہاں سے کسی نئی جگہ کی تلاش کے لیے کوچ کر دیتے' ان کی خانہ بدوش زندگی کا یہی راز ہے. (۵)

4 ___ علاقائی سطح:

جزیرۂ عرب کو کوہ سراۃ کے سلسلے نے، جو یمن سے شام تک پھیلا ہوا ہے' دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا ہے: (۱) مغربی حصہ؛ (۲) مشرقی حصہ۔ مغربی حصہ دامن کوہ

سراۃ سے لے کر ساحل بحیرہ احمر کے ساحل تک نشیبی ہے' اس لیے یہ علاقہ غور (نشیب) کہلاتا ہے۔ نیز گرمی زیادہ ہونے کی بنا پر تہامہ بھی کہلاتا ہے۔

مشرقی حصہ ابھرتا ہوا عراق اور ساوہ تک پھیل گیا ہے' سطح مرتفع ہونے کی بنا پر اسے ''نجد'' کہا جاتا ہے' ان دونوں حصوں کے درمیان علاقے کو ''حجاز'' کہتے ہیں' کیونکہ وہ ان دونوں علاقوں کے درمیان حد فاصل ہے۔

وہ حصہ جو مشرق میں نجد کو لیے ہوئے یمامہ' بحرین اور عمان کو اپنے اندر شامل کرتا ہے عروض کہلاتا ہے کیونکہ یہ یمن اور نجد کے درمیان عرضاً پھیلا ہوا ہے۔

حجاز سے جنوبی سمت میدانی علاقہ ''یمن'' کہلاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ وہ اس کے کعبہ کے دائیں جانب واقع ہے اور یا اس بنا پر کہ وہ سرسبز و شاداب علاقہ ہے۔

ارضی ساخت اور بناوٹ کے لحاظ سے جزیرۂ نمائے عرب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

① مغرب میں آتش فشاں اور تبدیل شدہ ہیئت والا ڈھال نما علاقہ اور زمانہ حال کے دردی علاقے جو شمال مشرق' مشرق اور جنوب مشرق میں' نیچے ہوتے ہوئے اس وسیع طاس سے جا ملتے ہیں جو عراق عرب' خلیج فارس اور الربع الخالی کے مشرقی حصے پر مشتمل ہیں؛ برکانی اور متغیر ہیئت کی چٹانوں کے یہ حصے ممکن ہے کہ قیمتی معدنیات سے مالا مال ہوں' لیکن اب تک بہت کم مقدار میں ان کی دریافت ہو سکی ہے۔

شمال اور جنوب کی سمت میں عرب کے اس ڈھال نما علاقے کی مشرقی حد' بحیرۂ احمر سے اندرون ملک میں زیادہ فاصلے پر واقع نہیں ہے' بلکہ ان دونوں سروں کے درمیان ایک بھدے سے ابھار کی شکل میں آگے چلی گئی ہے۔

یمن کے پہاڑ' جن کی ارضیاتی ساخت بہت مخلوط نوعیت کی ہے' طبیعاتی شکل و صورت کے اعتبار سے باقی ماندہ ڈھال سے مختلف ہیں۔

حضر موت اور ظفار کی سطح مرتفع سے جنوب کی طرف جو ڈھلان خلیج عدن اور بحیرۂ عرب تک جاتی ہے' وہ چھوٹی سی ہے' لیکن شمال کی طرف ایک زیادہ لمبی

ڈھلان الربع الخالی تک جاتی ہے۔ سطح مرتفع عمان میں ایک مختصر سی ڈھلان شمال مشرق کی سمت خلیج عمان تک جاتی ہے جنوب مغرب کی جانب۔ اس سے ایک بہت لمبی ڈھلان اسی ریتلے سمندر تک چلی گئی ہے' جزیرۂ سقطرای کو' جو ۱۱۰ کیلو میٹر لمبا اور عرب سے چار سو کیلو میٹر دور خلیج عدن کے مدخل پر واقع ہے' سیاسی اور نسلی دونوں اعتبار سے عرب کا حصہ سمجھنا چاہیے۔ اس طرح کے دیگر چھوٹے چھوٹے کئی جزائر بھی جزیرۃ العرب کا حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ (۶)

5___ قبائل عرب:

نامناسب نہ ہوگا کہ اپنے موضوع پر گفتگو قبل' عربوں کے قبائل کا ایک سرسری جائزہ لے لیا جائے۔ اس دور میں عربوں کی حسب ذیل تین بڑی شاخیں اور ان کے خاندان آباد تھے:

مؤرخین اقوام عرب کو مندرجہ ذیل اقسام میں تقسیم کرتے ہیں۔

1___ عرب بائدہ:

اس سے مراد جزیرۂ نمائے عرب کی ایسی اقوام ہیں جو قدیم زمانے میں مختلف ارضی وسماوی آفتوں کا شکار ہوکر فنا ہوگئیں' جیسے کہ (۱) عاد' (۲) ثمود' (۳) طسم و جدیس۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰى وَ ثَمُوْدَ فَمَآ اَبْقٰى (۶۔الف) اور یہ کہ اسی نے عاد اولی کو ہلاک کیا اور ثمود کو پھر کچھ باقی نہ چھوڑا۔

ان اقوام کی داستانیں ''سرزمین عرب...... میں اتنی عام تھیں کہ انہیں بہت سے شاعروں نے اپنے کلام میں بھی نظم کیا ہے' مثال کے طور پر رو بہ کہتا ہے:

بواد طسم بیدی جدیس...... (۶۔ب) طسم کی وادی میں جدیس نامی قوم ہلاک ہوئی۔

2___ عرب عاربہ:

اس سے وہ عرب قبیلے مراد ہیں' جو اول الذکر اقوام اور قبائل کی ہلاکت کے

بعد' سرزمین عرب کے وارث ہوئے اور جن کا قدیم اور اصلی وطن' "یمامہ" تھا۔ اسی نسل کو "قحطان" کہا جاتا ہے جو کہ "یمن عربی" (جنوبی عرب) میں آباد قبائل کا گروہ ہے..... قحطان کی تین بڑی شاخیں قضاعہ' کہلان اور ازدحمیر ہیں: ان میں سے ہر ایک کی شاخیں حسب ذیل ہیں.

(ا) بنو قضاعہ:

بنو قضاعہ کو علمائے انساب قحطان میں داخل کرتے ہیں۔ ورنہ ازروئے تحقیق وہ بنو اسماعیل ہیں۔ ان کی حسب ذیل شاخیں ہیں:

① بنو کلب ② بنو تنوخ ③ بنو جرم ④ بنو جہینہ
⑤ بنو نہد ⑥ بنو عذرہ ⑦ بنو اسلم ⑧ بنو بلی
⑨ بنو سیح ⑩ بنو خلجم ⑪ بنو تغلب ⑫ بنو نمر
⑬ بنو اسد ⑭ بنو تیم اللات ⑮ بنو کلب

(ب) کہلان:

① بجیلہ ② خثعم ③ جدان ④ کندہ
⑤ مذحج ⑥ لخم ⑦ جذام ⑧ عائلہ

(ج) ازدحمیر:

① اوس ② خزرج ③ غسان ④ دوس

(۳) مستعربہ:

یہ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد ہیں' جو انیسویں صدی قبل عیسوی میں حجاز آ کر ٹھہرے اور شاہان جرہم سے دامادی کا رشتہ جوڑ کر وہاں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ انہیں عدنانی قبائل بھی کہا جاتا ہے.

عدنانی قبائل جن کا آخری مقسم مضر ہے' اولاً دو خاندانوں میں منقسم ہیں:

(الف) خندف:

① بنو ھذیل ② بنو کنانہ ③ بنو اسد ④ بنو ضبہ
⑤ بنو مزینہ ⑥ بنو رباب ⑦ بنو تمیم ⑧ بنو ہون

ان میں سے ہر ایک کی متعدد فروع ہیں تفصیل یہ ہے:

اصول	فروع
بنو کنانہ:	① قریش ② دول
بنو ہون:	① بنو قارہ
بنو رباب:	① بنو عدی ② بنو تیم ③ عکل ④ ثور
بنو تمیم:	① بنو مقاعس ② بنو قریع ③ بنو بہدلہ ④ بنو یربوع ⑤ بنو ریاح ⑥ بنو ثعلبہ ⑦ بنو کلیب

پھر قریش کی ذیلی اقسام یہ ہیں:

① بنو جمح ② بنو سہم ③ بنو مخزوم
④ بنو تیم ⑤ بنو عبدالدار ⑥ بنو عبدمناف

عبدمناف کی دو شاخیں:

① بنو امیہ اور ② بنو ہاشم تھیں۔

قیس:

① بنو عدوان ② غطفان ③ اعصر ④ سلیم ⑤ ھوازن۔

ان میں سے بعض کی فروع حسب ذیل ہیں:

اصول	فروع
غطفان:	① بنو عبس ② ذبیان ③ فزارہ ④ مرہ
اعصر:	① غنی ② بنو باھلہ
بنو ھوازن:	① بنو سعد ② بنو نصر ③ بنو جشم ④ بنو سلول

جبکہ بنو عامر کی شاخیں درج ذیل ہیں:

یہود: ① بنو ھلال ② بنو نمیر ③ بنو کعب

یہودیوں کے مشہور قبیلے درج ذیل تھے:

① بنو قینقاع ② بنو نضیر ③ بنو قریظہ (۷)

(۲) رہائشی مقامات:

ابتداء میں قحطانیوں نے یمن میں رہنا شروع کیا۔ جب ان کی آبادی کے ساتھ ساتھ ان کا روشن تمدن رونما ہوا اور انہیں اس علاقے کی آب و ہوا راس نہ آئی تو وہ دوسرے علاقوں کی طرف منتقل ہونا شروع ہو گئے۔ چنانچہ کہلان میں سے ثعلبہ بن عمرو حجاز کی سمت نکل گئے' اوس و خزرج (قبائل وانصار) انہی کی نسل سے ہیں' خزاعہ' سرزمین حرم میں جا ٹھہرے' عمران بن عمرو نے عمان کی راہ لی' جہاں ان کی اولاد ازدعمان کے نام سے مشہور ہوئی۔ نصر بن الازد کے قبائل نے تہامہ کو وطن بنا لیا اور ازد شنوءہ کہلائے۔ جفنہ بن عمرو شام میں رہائش پذیر ہوئے جہاں اس کی نسل میں غساسان شام ہوئے' بنو لخم حیرہ میں رہے۔ انہیں میں سے نصر بن ربیعہ ہیں جو شاھان حیرہ (مناذرہ) کے جداعلیٰ ہیں۔

عدنانیوں نے حجاز اور اس سے متصل عراقی سبزہ زار میں بود و باش اختیار کی' چنانچہ قریشی خاندانوں نے مکہ اور اس کے آس پاس کے علاقے کو اپنا مسکن بنایا' کنانہ کے قبائل نے تہامہ کو آباد کیا۔ بنو ذبیان تیماء و حوران کے درمیانی علاقے میں فروکش ہوئے۔ بنو ثقیف طائف میں آ بسے' ھوازن مکہ کے مشرق اور بنو اسد کوفہ سے مغربی اور تیماء سے مشرقی جانب اور بنو تمیم نے بصرہ کے دیہاتوں میں ڈیرہ ڈال دیا۔ تغلبی قبائل نے جزیرۂ فرات کو اپنا مسکن بنایا' بقیہ تمام بکر بن وائل یمامہ کے ساحلی علاقہ اور بصرۂ کوفہ کے درمیان علاقہ میں آباد ہو گئے۔ (۸)

(۲) جاہلی معاشرہ

1____ سیاسی حیثیت:

سیاسی اعتبار سے عربوں کا قبل از اسلام زمانے میں کوئی قابل ذکر کردار نہ تھا۔ عرب کے بعض علاقوں پر کچھ عرب خاندانوں حکمران تھے' مگر وہ خود مختار نہ تھے' بلکہ رومیوں اور ایرانیوں کے باجگزار تھے۔ مثلاً حیرہ کا لخمی خاندان ایرانیوں کا اور شام کا غسانی قبیلہ روم کا باج گزار تھا۔ اس کے علاوہ باقی عرب علاقہ مکمل طور پر آزاد اور خود مختار تھا اور اس خطے میں جنگل کا قانون' یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس صحیح معنوں میں رائج تھا۔ بعض قبائل کا دن دہاڑے مسافروں' قافلوں اور پردیسیوں کو بے خطر لوٹ لینا محبوب مشغلہ تھا۔ کمزوروں اور ضعیفوں کی امداد واعانت کے بجائے ان کی تذلیل وتضحیک ان کی عادت تھی۔ خاندان ایک وحدت (Unit) ان کے سیاسی نظام کی بنیاد تھی' ہر قبیلہ میں شامل کرنے کے اختیارات اور ذمہ داریاں ''شیخ قبیلہ'' کے پاس ہوتی تھیں۔ شیخ کے مرنے کی صورت میں فوراً کوئی نیا شیخ (سردار) چن لیا جاتا تھا۔[۹] اکثر قبائل میں یہ منصب متوارث ہوتا تھا' چنانچہ ایک عرب شاعر کہتا ہے:

اذا سید منا خلا قام سید　　　قؤل لما قال الکرام فعول

(جب کوئی ہمارا سردار مر جاتا ہے تو دوسرا سردار اس کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ جو شرفاء کے اقوال وافعال کا پابند ہوتا ہے)

ایک اور شاعر کا کہنا ہے:

لیس یھلک منا سید ابدا   الا افتلینا غلاماً سیداً فینا [۱۰]

(جب ہمارا سردار مرتا ہے' تو ہم کسی شیر خوار بچے کو دودھ چھڑا کر اپنا سردار بنا لیتے ہیں)

سرداری کے لیے بہادری' فنون جنگ میں مہارت' فیاضی' دریادلی اور بعض صورتوں میں سفا کی و خون ریزی اور اس کے ساتھ تمول و خوشحالی لازمی خیال کی جاتی تھی۔ بعض اوقات ان اوصاف کے ساتھ ملکۂ خطابت اور قوت شاعری بھی جمع ہو جاتی تھی تو سونے پر سہاگے کا کام دیتی تھی۔ جیسا کہ تغلبی سردار عمرو بن کلثوم کی صورت میں یہ صورت حال نظر آتی ہے۔

الغرض قوم کا امیر ایک چھوٹا سا خود مختار بادشاہ ہوتا تھا' جو صلح و جنگ دونوں حالتوں میں قیادت کا فریضہ سرانجام دیتا۔ اس طرح قبل از زمانہ اسلام کے عرب میں کئی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم تھیں اور طوائف الملوکی کا مفہوم اپنی مکمل ترین شکل میں واضح ہو رہا تھا۔

2 ___ خاندانی نظام:

خاندانی نظام میں باپ بنیادی حیثیت رکھتا تھا۔ اسے گھر والوں پر لامحدود اختیارات حاصل تھے، حتی کہ ان میں کسی ایک کو مارنا یا زندہ رکھنا بھی اسی کی مرضی پر منحصر تھا۔ ان میں سے جسے چاہتا وہ بیچ سکتا اور جسے چاہتا عاق کر دیتا۔ وہ مفلسی کے اندیشے سے لڑکیوں کا زندہ دفن کر دیتا اور بسا اوقات اپنی لونڈی کے بچے کو اپنانے سے انکار کر دیتا۔

خاندان میں شوہر کے بعد بیوی کا درجہ تھا۔ شوہر اس کا احترام ملحوظ رکھتا' اپنے شعروں میں اسی کی محبت کے گیت گاتا۔ [۱۱]

عام حالت یہی تھی' لیکن بعض اوقات شعراء دوسری عورتوں سے بھی اپنے پیار اور محبت کی داستانیں مزے لے لے کر بیان کرتے تھے' جیسا کہ امرؤ القیس کے معلقہ میں ہمیں یہی صورت حال نظر آتی ہے۔ اس خاندانی نظام کی اساس چونکہ

طاقت وقوت پر تھی، اسی لیے ان کے ہاں لڑکوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی' جبکہ لڑکیوں کی پیدائش کو کمزوری اور نحوست تصور کیا جاتا تھا.

3___ مذہبی حالت:

اسلام سے پہلے عربوں کی مذہبی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی' اگرچہ وہاں کئی ''مذاہب'' موجود تھے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1___ مشرکانہ مذہب:

سرزمین عرب پر' اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی توحید اور وحدانیت کا درس دیا تھا، لیکن مرور ایام سے حالات بدل گئے تھے اور کفر و شرک یہاں عام ہوگیا تھا۔ یہی عربوں کی کثیر آبادی کا مذہب تھا اور جزیرۃ العرب کے زیادہ تر باشندے اسی مذہب کے پیروکار تھے۔ ''شرک'' ان کے ہر عمل اور ہر حرکت سے نمایاں ہوتا تھا۔ ان کی گفتگو' ان کا ادب اور ان کی معاشرت' الغرض ہر عمل میں شرک کی آمیزش واضح طور پر محسوس کی جاسکتی تھی۔ مشہور روایت کی رو سے عرب میں بت پرستی کا بانی عمرو بن ربیعہ بن حارثہ تھا اور ربیعہ وہی عمر بن لحی بن حارثہ بن عمرو الازدی ہے جو خزاعہ کا جد امجد ہے۔ اس نے بنو اسماعیل کو اپنے ساتھ ملا کر بنو جرہم کو لڑ کر مکہ مکرمہ سے نکال دیا تھا اور خود کعبہ کا متولی ہوگیا تھا اس نے شام کے علاقہ بلقاء سے بت خریدے اور عرب میں ان کی پوجا کو رواج دیا۔ (۱۲)

بعد ازاں اگرچہ قریش مکہ نے کعبہ کا قبضہ بنو خزاعہ سے لے لیا' لیکن وہ بنو خزاعہ کے بتوں کو کعبہ سے نہ نکال سکے۔ مشہور روایت کی رو سے فتح مکہ کے وقت بیت اللہ شریف میں تین سو ساٹھ بت نصب تھے۔ اس کے علاوہ کئی اور مقامات پر بھی بت رکھے ہوئے تھے' جن کی باقاعدہ پوجا کی جاتی تھی.

مشہور بت اور ان کی پجاری قبائل کے نام حسب ذیل ہیں:

نام بت	مقام	اس بت کا پجاری قبیلہ
لات	طائف	ثقیف

عزیٰ	مکہ معظمہ	قریش وکنانہ
منات	مدینہ منورہ	اوس' خزرج اور غسان
ود	دومۃ الجندل	کلب
سواع		ہذیل
یغوث		مدحج اور بعض قبائل یمن
یعوق		ہمدان

2 مذہب حنیفی:

تاہم حضرت اسماعیلؑ کے دین حق کی کچھ باقیات موجود تھیں۔ جن میں سے حنیفی لوگوں کی موجودگی سب سے نمایاں ہے۔ اسی معاشرے میں کچھ لوگ مشرکانہ عقائد و رسوم سے بیزار تھے۔ ان کو یہ منظر نہایت نفرت انگیز معلوم ہوتا تھا کہ انسان عاقل ہو کر جمادات کے سامنے سر جھکائے' اس تحریک کا زمانہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے کچھ سال قبل شروع ہوا۔[۱۳] ان لوگوں کی زیادہ تر تعداد اہل مکہ پر مشتمل تھی' یہ گنتی کے چند افراد تھے' جن کے نام یہ ہیں:

① ورقہ بن نوفل: انہوں نے بعد ازاں عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ آنحضور ﷺ پر بھی ایمان لانا ثابت ہے۔

② عبیداللہ بن جحش: اس نے پہلے اسلام قبول کیا اور حبشہ کی پہلی ہجرت میں شریک ہوا۔ مگر وہاں جا کر مرتد ہو گیا اور عیسائی مذہب اختیار کر لیا اور اسی مذہب پر اس کی موت واقع ہوئی۔

③ عثمان بن الحویرث: اس نے شام جا کر عیسائی مذہب اختیار کیا تھا۔

④ زید بن عمرو: آخری وقت تک اپنے دین ابراہیمی قائم رہے۔

⑤ امیہ بن الصلت: آپ کا زمانہ پایا، مگر اسلام قبول کیا اور نہ ہی عیسائیت اختیار کی۔

⑥ قس بن ساعدہ الایادی — عیسائی ہو گیا تھا۔

⑦ قیس بن شیبہ [۱۴] — (حالات معلوم نہیں)

ان لوگوں نے بت پرستی یا شرک سے تو کنارہ کشی اختیار کر لی تھی' مگر اس کے بعد ان کے حالات مختلف ہو گئے تھے۔ کوئی مذاہب کے درمیان لٹکا رہا۔ کسی نے عیسائیت اختیار کر لی اور کسی نے ...... مذہب اسلام کو اپنا لیا۔

3___ عیسائیت:

عرب میں عیسائیت کا اثر و رسوخ دوسرے قدیم مذاہب کے مقابلے میں سب سے زیادہ تھا۔ ابن قتیبہ کے مطابق قبائل ربیعہ و غسان نصرانیت اختیار کر چکے تھے۔ قضاعہ میں بھی اس کا اثر پایا جاتا تھا۔

ان قبائل میں عیسائیت کی اشاعت شام کے راستے سے ہوئی۔ اس لیے کہ عرب لوگ تجارت کی غرض سے اکثر شام کے علاقے میں آمدورفت رکھتے تھے۔ اسی بنا پر ان کا وہاں کے مقبول عام مذہب سے متاثر ہونا فطری امر تھا۔ حیرہ میں عربوں کے متعدد قبائل نے اجتماعی طور پر نصرانیت اختیار کر لی تھی' انہیں ''عباد'' کہا جاتا تھا۔ ان میں سے عدی بن زید بھی عبادی تھا۔

بنو تغلب بھی عیسائی تھے۔ جو بڑی طاقت اور شان و شوکت والا عرب قبیلہ تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان سے اس شرط پر مصالحت کی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو بپتسمہ نہیں دیں گے اور ان کا جزیہ دوگنا ہوگا۔ اس کی ادائیگی میں مرد اور عورت یکساں ہوں گے' یہی اصول ان کی اراضی پر بھی نافذ کیا گیا' چنانچہ ان سے دوگنا خراج وصول کیا جاتا تھا۔[۱۵]

اسی طرح نجران کے لوگ بھی عیسائی مذہب رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے ''نجران'' میں اپنی الگ حکومت قائم کر رکھی تھی۔ ایک روایت کی رو سے وہاں ہر وقت ایک لاکھ جنگجو نوجوان جنگ کے لیے مستعد رہتے تھے۔ اس بیان میں اگر مبالغہ بھی ہو تب بھی اس میں شبہ نہیں کہ ان کے ہاں ایک بڑی طاقت ور فوج مدافعت کے لیے

موجود رہتی تھی۔ ان لوگوں کا ایک وفد' جس میں ان کے اشراف شامل تھے' نبی اکرم ﷺ سے مناظرہ کرنے کے لیے (۹ ھ میں) مدینہ منورہ آیا اور کئی روز مسجد نبوی کے صحن میں مقیم رہا۔ ان کے اعتراضات یا شبہات کا جواب دینے کے لیے سورۃ آل عمران کی (۱ تا ۹۱) آیات نازل ہوئیں۔ جن میں دوسری باتوں کے علاوہ انہیں مباہلے کی دعوت دی گئی' مگر وہ مقابلے پر نہ آئے اور جزیہ دینا قبول کر لیا۔

عرب کے قبیلہ بنوتمیم کا سردار ''عدی بن حاتم'' بھی قبول اسلام سے قبل عیسائی تھا۔ بعد ازاں اس نے سعادت اسلام حاصل کی۔

اس طرح مکہ مکرمہ میں بھی چند نفوس' مثلاً ورقہ بن نوفل' عبید اللہ بن جحش وغیرہ' عیسائی مذہب رکھتے تھے۔ (۱۶)

4 ___ یہودیت:

اسلام سے قبل جو مذاہب عربوں میں اپنا اثر رکھتے تھے' ان میں چوتھا مذہب یہودیت کا تھا۔ یہاں جو آباد تھے۔ انہیں آسانی کے لیے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(الف) تارکین وطن:

عرب کے زیادہ تر یہودی وہ تھے جو بیرون عرب بالخصوص فلسطین سے اس زمانے میں ترک وطن کر کے ''سرزمین عرب'' میں آباد ہو گئے تھے جب فلسطین اور اس کے گرد و نواح میں ان کے لیے حالات سازگار نہ رہے تھے...... ان لوگوں نے وہاں سے ترک وطن کر کے ''خیبر'' اور ''مدینہ منورہ'' میں سکونت اختیار کر لی۔

مدینہ منورہ میں طلوع اسلام سے قبل ان کا جو اثر و رسوخ تھا' وہ اس بات سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ یہاں کے سیاہ و سفید کے مالک تھے اور ان کی ''مرضی'' کے بغیر یہاں کوئی کام بھی انجام پذیر نہ ہوتا تھا...... نبی اکرم ﷺ کی آمد سے' ان کا یہ سیاسی اثر ختم ہو گیا' جس کی بنا پر یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف ہو گئے۔

اَلآلوسی نے لکھا ہے کہ یمن کے آخری تبع (حسان بن تبع بن کلیکرب بن تبع اقرن) نے اپنے بھانجے حارث بن عمرو بن حجر الکندی کو' جو مشہور شاعر امرؤ القیس کا

دادا تھا' جب قبیلہ معد کا بادشاہ بنا کر' علاقہ حجر کی طرف بھیجا..... تو اس کے پاس لوگوں نے یثرب سے آ کر یہ شکایت کی کہ یہودی جن شرائط پر یثرب میں آباد ہوئے تھے' انہوں نے ان شرائط کی خلاف ورزی شروع کر دی ہے..... اس پر حارث کو غصہ آیا اور اس نے یثرب پر حملہ کر دیا اور اس نے ساڑھے تین سو یہودیوں کو پکڑ کر قید کر کے مار دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ یثرب کو بالکل ویران کر دے' جس پر ایک یہودی عالم نے اس کو بتلایا کہ وہ اس جگہ کو اس لیے تاراج نہیں کر سکتا' کیونکہ یہ بنی اسماعیل کے نبی کی ہجرت گاہ ہے' جس پر حارث وہاں سے چلا گیا اور اس نے بعد میں یہودی مذہب اختیار کر لیا' چنانچہ اس کے اثر سے یہودیت بنو کنانہ' بنو کندہ اور بنوالحارث بن کعب اور بنو حمیر میں اشاعت پذیر ہوئی۔ (۱۷)

(ب) عرب کے اصلی باشندے:

یہودیوں کی دوسری قسم ان لوگوں پر مشتمل تھی' جو اصلاً عرب کے باشندے تھے اور انہوں نے یہودیوں کی تبلیغ اور دعوت سے متاثر ہو کر یہودی مذاہب اختیار کر لیا تھا۔

الطبری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اوس و خزرج کے ہاں یہ رواج تھا کہ جن لوگوں کے گھروں میں اولاد نہ ہوتی تھی وہ نذر مان لیتے تھے کہ اگر ان کے ہاں اولاد ہو گی تو وہ اسے یہودی بنا دیں گے' چنانچہ اس رسم کے تحت بہت سے لوگوں کو یہودی بنا لیا گیا تھا۔ (۱۸) اس لیے بقول ڈاکٹر محمد حمید اللہ قرآنی جمل ''الذین ھادوا'' کا ترجمہ یہودی نہیں ہے' بلکہ ''یہودی بنے ہوئے لوگ'' ہے۔ (۱۹)

بایں ہمہ' عیسائیت کے مقابلے میں یہودیت کی ترویج بہت کم تھی۔

مدینہ منورہ سے باہر ''خیبر'' ان کا بڑا مرکز تھا، بنونضیر نے یہیں سے ''غزوۂ خندق'' کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ خیبر کے آس پاس بنوعذرہ' وادی القریٰ' فدک اور تیماء وغیرہ میں بھی یہودی آباد تھے۔ یہ تمام علاقے ۷ھ میں فتح ہوئے۔ مؤخر الذکر مقام یعنی تیماء میں سمؤال بن عادیا کا خاندان حکمران تھا' جس کی وفاداری پورے عرب میں ''ضرب المثل'' کی حیثیت رکھتی ہے اور جس نے اپنا قول نباہنے کے لیے

اپنے بیٹے تک کو قربان کر دیا تھا..... سموال بن عادیا ایک شاعر بھی تھا' اس کا دیوان حال میں ہی طبع ہوا ہے۔ اس کی زبان اور حالات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عربی النسل تھا اور اس نے یہودی مذہب خود اختیار کیا تھا.

مکہ مکرمہ میں یہودی برائے نام تھے' جناب عبدالمطلب کے زمانے میں صرف ایک یہودی تاجر کا ذکر آتا ہے' جو وہاں مال لا کر فروخت کیا کرتا تھا.

یمن میں ذ دعمرو ایک یہودی سردار تھا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد آپ کی پیشین گوئیوں کو پورا ہوتے ہوئے دیکھ کر اسلام قبول کر لیا تھا...... البلاذری کے مطابق طائف میں بھی چند یہودی آباد تھے.

نبی اکرم نے صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وصال کے وقت یہ وصیت فرمائی تھی' کہ یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے نکال دیا جائے' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس پر عمل ہوا اور انہیں مدینہ، یمامہ، خیبر، ینبع اور اس کے مخالف (تعلقوں) سے نکال دیا گیا۔ البتہ تیماء اور یمن میں وہ بدستور آباد رہے. (۲۰)

(د) دیگر مذاہب:

ان مشہور مذاہب کے علاوہ عرب میں دوسرے مذاہب بھی پائے جاتے تھے' جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1 ___ ستارہ پرست:

عرب کے بعض قبائل ستاروں' سورج' چاند اور دیگر مظاہر فطرت کی پوجا کرتے تھے' ان کا عقیدہ تھا کہ ستارے ہماری اچھی اور بری تقدیر کے مالک ہیں.

2 ___ دھر پرست:

ایک اور قسم زمانے کو ''خدا'' اور دنیا کو ''بے خدا'' سمجھنے کی قائل تھی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ یہ جہان کسی نے پیدا نہیں کیا' بلکہ یہ جہان اپنے آپ پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کا یہ عقیدہ نقل کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَقَالُوْ مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ (۲۱)

اور یہ (کافر) کہتے ہیں، کہ ہماری زندگی تو صرف دنیا ہی کی ہے کہ یہیں مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں تو بس زمانہ مارتا ہے۔

3____ صابئ:

صابئ یا صابئین کی تشریح میں اختلاف ہے، اگرچہ بعض مفسرین نے اس سے مراد ستارہ پرست لیے ہیں، مگر اآلوسی (صاحب بلوغ الارب) کی تحقیق کی رو سے صابئ سے مراد ''انواء پرست ہیں، ان کا انواء کے متعلق وہی عقیدہ تھا، جو ستارہ پرستوں کا ستاروں کے متعلق تھا، یہاں تک کہ جب صابئ کوئی حرکت کرتا، یا مقیم ہوتا، یا سفر کرتا، تو ایک نہ ایک نوء اس کے ساتھ ہوتا تھا، ان لوگوں کا خیال تھا کہ فلاں نوء کی بدولت بارش ہوتی ہے۔ نوء کے معنی موسم یا کیفیت کے ہیں:

بقول اآلوسی صابئ دنیا کی بڑی امتوں میں سے ایک امت ہیں، البتہ ان کی تشریح میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ (۲۲)

4____ مجوسیت:

ایران کے زیر اثر بعض عرب قبائل پر مجوسی اثر بھی تھا، مثال کے طور پر ''ازرارہ تمیمی'' نے اسی کے زیر اثر اپنی بیٹی سے نکاح کر لیا تھا۔ اسی طرح اقرع بن حابس بھی پہلے مجوسی تھے۔ (۲۳) ان کے علاوہ بھی متعدد عقائد، اوہام و تصورات یا عقائد باطلہ پر مشتمل مذہب یا گروہ پائے جاتے تھے، جن کی تفصیل جاہلی دور کی تاریخوں میں مل سکتی ہے۔ (۲۴)

5____ علمی حالت:

عام طور پر اس وقت کے عربوں کی علمی حالت نہایت پست تھی۔ ان میں جہالت کی فراوانی تھی۔ اسی مناسبت سے اس دور کو ''دور جاہلیت'' کہا جاتا ہے، مگر اس کا یہ مفہوم لینا بھی غلط ہے کہ ان میں مکمل طور سے علمی ابتری پھیلی ہوئی تھی۔

اس میں شبہہ نہیں کہ اکثریت کی حالت واقعی ایسی تھی، مگر اس کے ساتھ ساتھ

ان میں کم ہی سہی اہل علم طبقہ بھی موجود تھا، چنانچہ حسن زیات لکھتے ہیں.

''ان کی عقلی حالت اور علمی مقام کا اندازہ تبابعہ (تبع بادشاہوں)' حیرہ کے مناذر فرمانرداؤں اور شامی حکمرانوں غساسنہ کے عظیم کارناموں سے ہوسکتا ہے۔ انہوں نے عالیشان بند بنائے' بنجر زمینوں کو کاشت کے قابل بنایا۔ ویرانوں کو آباد کیا' شہروں کو بسایا' لیکن بایں ہمہ ان کی ترقی کا صحیح مقام اور ان علوم کی حقیقت ہم پر اس وقت تک پوشیدہ رہے گی' جب تک کہ آثار قدیمہ کے ماہرین اپنی تحقیق کی روشنی اس پر نہ ڈالیں گے.''(۲۵)

ان کی علمی اور عقلی حالت کا اندازہ عربوں کی قائم کردہ سلطنتوں اور ان کے عظیم الشان تمدن سے ہوتا ہے جس کے آثار مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ بہر حال ان کی علوم کی صورت حال حسب ذیل ہے:

(1) تحریر و کتابت:

کتابت بھی تہذیب و تمدن کے مظاہر میں سے ہے۔ دور قبل از اسلام میں بعض غیر عربی اقوام' مثلاً (فینیقی' مصری وغیرہ) تحریر و کتابت میں عربوں سے پیش پیش تھیں۔ اہل یمن بھی اس فن سے آگاہ تھے' ان کے خط کو ''مسند'' کہتے تھے۔ مسند کی تمام ذیلی شاخیں (صفوی' ثمودی' لحیانی اور حمیری) خط فینیقی سے نکلی ہیں.

خط آرامی سے حوران میں ''نبطی'' اور عراق میں ''سطرنجیلی'' سریانی نکلا۔ یہی دونوں خط عربی رسم الخط کی اصل ہیں۔ اول الذکر سے خط ''نسخ'' اور مؤخر الذکر سے خط ''کوفی'' جو قبل از اسلام' [حیری'' کہلاتا تھا] نکلا۔ خط نسخ اہل عرب نے ''اہل انبار'' سے سیکھا۔ یہ رسم الخط بشر بن عبدالملک کندی برادر اکیدر بن عبدالملک والی دومۃ الجندل نے سیکھا تھا۔ وہ جب مکہ گیا تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دادا حرب بن امیہ کا داماد بن گیا۔ اس نے وہاں کئی لوگوں کو یہ فن سکھایا۔ اس طرح زمانہ قبل از اسلام میں بہت سے لوگ اس فن سے آگاہ ہو گئے۔ ایک روایت کے مطابق اسلام سے پہلے ۱۷ آدمی مکہ میں اس فن سے آگاہ تھے.(۲۶)

اسلام کی آمد اور اشاعت کے بعد قرآن و سنۃ کی کتابت کی ضرورت کی بنا پر، اور اسلام کے ہاں علم کی فضیلت و اہمیت کی وجہ سے، علم کتابت نے بہت ترقی کی اور عربوں نے کئی نئے نئے خط ایجاد کیے۔

(2) علم الاشعار:

اہل عرب کا قابل فخر علمی سرمایہ اشعار کے دواوین ہیں۔ عربوں کو بے شمار اشعار زبانی یاد ہوتے تھے۔ اشعار کا یاد کرنا ان کے لیے باعث فخر اور موجب افتخار ہوتا تھا۔ اکثر لوگوں کو بڑے بڑے شعراء کا کلام ازبر ہوتا تھا۔ ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں کہ ادھر شاعر کی زبان سے قصیدہ نکلا اور ادھر گھر گھر اس کے چرچے عام ہو گئے۔ پردہ دار خواتین تک اس فن سے آگاہ اور اس میں ماہر ہوتی تھیں۔ خود امّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو سیکڑوں اشعار زبانی یاد تھے۔ ایچ۔ اے آر۔ گب (H.A.R.Gibb) کے مطابق ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک ہی مجلس میں دو ہزار نوسو طویل نظمیں پڑھ کر سنا دیں۔ [۲۷] عام طور پر ہر ایک بڑے شاعر کے ساتھ ایک ''راوی'' بھی ہوتا تھا' جو اس شاعر کے تمام اشعار کو یاد رکھتا اور انہیں دوسروں کے پاس روایت کرتا تھا۔

عربوں کے اشعار سے عقلی اور فکری اخلاقی و عملی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ عربوں کی قدیم، یعنی جاہلی دور کی شاعری کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ لوگ مختلف انسانی علوم' مثلاً علم التاریخ، علم الانساب' فلسفۂ و حکمت، درایت اور مطالعہ فطرت وغیرہ میں بہت گہری دسترس رکھتے تھے۔ اس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ عربوں کو اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر' ذہین و فطین پیدا کیا تھا اور تمام بڑے بڑے علوم تک ان کو رسائی حاصل تھی۔

(3) علم التاریخ:

گو ان کی اکثریت طبقہ جہلاء پر مشتمل تھی' جو نوشت و خواند سے چنداں واقفیت نہ رکھتے تھے' مگر اس کے باوجود انہیں اپنے اسلاف کے کارنامے اور اپنی اور اپنے

علاقے کی تاریخ سے مکمل نہ سہی کسی قدر آگاہی ضرور تھی۔ اس واقفیت کو وہ اپنے اشعار میں اس وقت استعمال کرتے' جب مفاخرت کا بازار گرم ہوتا۔ ایک دوسرے پر اپنی اور اپنے آباؤ اجداد کی برتری کو قابل فخر کارناموں کے ذریعے ظاہر کرتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ''علم تاریخ'' میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام سب سے زیادہ معروف ہے۔ وہ علم الانساب اور ''شعر'' شناسی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

(4) علم الفطرت:

اہل عرب چونکہ سادہ و بے تکلف زندگی بسر کرتے۔ انہیں کھلے آسمان تلے موسموں کا اتار چڑھاؤ سہنا اور برداشت کرنا ہوتا تھا۔ اس طرز زندگی نے جہاں ان کو مستقل مزاج اور غیور طبع بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہاں اس کے ساتھ ساتھ انہیں فطرت کے رموز و اشارات سے بھی آگاہی بخشنے میں کوتاہی نہیں کی۔ وہ ہواؤں کے چلنے کے انداز سے آنے والے موسم کا اندازہ اس حیرت انگیز طریقے سے لگا لیتے تھے کہ آج کے ترقی یافتہ انسان کو حیرت ہوتی ہے۔

(5) قوت حافظہ:

ان سب سے بڑھ کر ان کا اصلی جوہر ان کا حیرت انگیز حافظہ تھا، جس کی بنیاد پر قدیم عربی دور کے علوم و فنون کا ذخیرہ محفوظ رہ سکا۔ اشعار کے راوی، بالخصوص' اس دولت سے مالا مال ہوتے تھے۔ ان کے حافظے میں بیک وقت کئی کئی شعرا کا کلام محفوظ ہوتا تھا۔ عربوں کے اس وصف میں دنیا کی شاید ہی کوئی قوم ان کا مقابلہ کر سکے۔ یہ حیرت انگیز وصف ان کا وہ طغرائے امتیاز ہے جس کی مثال تلاش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ (۲۸)

(6) اقتصادی حالت:

مجموعی طور پر اہل عرب کی اقتصادی حیثیت کمزور تھی۔ ان کو بنیادی طور پر اقتصادی اعتبار سے ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

① خانہ بدوش قبائل:

ان لوگوں کی گزر اوقات عام طور پر ریوڑوں پر ہوتی تھی۔ یہ لوگ کھلے آسمان تلے پانی اور چارے کی تلاش میں ملک ملک اور جنگل جنگل گھومتے تھے۔ جہاں انہیں یہ اشیاء میسر آ جاتیں وہاں یہ لوگ اس وقت تک مقیم رہتے جب تک ان کے لیے پانی اور چارے کی سہولت موجود رہتی۔ جوں ہی یہ نعمت قریب الاختتام ہوتی تو یہ لوگ فوراً ہی کسی نئی ''جائے قیام'' کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ یہ لوگ اپنے جانوروں کا دودھ پیتے' ان کی اون سے کپڑے بنتے' ان کے گوشت سے کام ودھن کو لذت اور حلاوت بخشتے۔ جب ضرورت ہوتی تو ان کو فروخت کر کے معقول معاوضہ حاصل کر لیتے۔ اس طرح یہ جانور ہی ان کی اقتصادی زندگی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسی بنا پر جانوروں کی کمی بیشی سے ان میں دو طبقات: (۱) بہت زیادہ امیر' (۲) اور بہت زیادہ غریب موجود تھے۔ اس کے علاوہ بعض قبائل (مثلاً اسلم وغفار) رہزنی اور ڈکیتی کے ذریعے بھی معقول آمدن حاصل کر لیا کرتے تھے۔

② شہری (حضری) قبائل:

دوسرا بڑا طبقہ ان لوگوں کا تھا جو شہری زندگی کے عادی تھے۔ انہوں نے بڑے بڑے شہر آباد کیے ہوئے تھے۔ یہ لوگ یا تو زراعت پیشہ تھے' جیسے یثرب (مدینہ) کے اوس وخزرج' خیبر کے بعض یہودی قبائل اور یا تجارت پیشہ تھے، جیسے مکہ مکرمہ کے قریش۔

یہ لوگ اقتصادی اور تمدنی اعتبار سے قسم اول سے کافی بہتر اور عمدہ حالت میں تھے۔ یہ لوگ موسمی تغیرات کے ناخوشگوار اثرات اور فکر فردا سے کسی قدر کم خائف تھے۔ ان کے سامنے زندگی کا ایک واضح تصور موجود تھا۔ جس پر وہ بڑی مہارت اور ثابت قدمی سے چل رہے تھے۔

(6) عربوں کی اخلاقی حالت:

عربوں کی ''مذہبی اور اخلاقی اساس'' سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے بابرکت ہاتھوں

سے رکھی گئی تھی۔ پھر وہ صدیوں تک کعبہ کے متولی رہے تھے' اس لیے ''خیر'' اور نیکی کا جذبہ ان کی سرشت میں موجود تھا اور ان کی صلاحیتیں فطرت (Nature) کے بہت قریب تھیں۔ اسی لیے قدرت نے نبی آخرالزمان کی معیت اور نصرت کے لیے ان کا انتخاب کیا تھا.

تاہم مرور ایام سے ان میں سے بہت سی خرابیاں اور برائیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ جن میں سے چند ایک کا سطور بالا میں ذکر آ چکا ہے' مثلاً ان میں قتل و خونریزی' چوری' ڈکیتی' اور شراب نوشی کثرت تھی...... بت پرستی کا عام رواج تھا۔ بدکاری اگرچہ عام نہ تھی' اس لیے کہ شرفا اس کو معیوب سمجھتے تھے' تاہم اس کے متعلق جاہلی معاشرے میں بہت گنجائش موجود تھی...... اور اس کی بعض صورتیں ان کے نزدیک قانوناً جائز تھیں.

ان کے علاوہ ان میں حسب ذیل دوسری برائیوں کا بھی پتہ چلتا ہے.

1 ___ سودخوری:

مرور ایام سے سود لینے اور سود دینے کا رواج بہت ترقی اختیار کر گیا تھا اور عرب میں بڑے بڑے شرفا اس میں کوئی قباحت نہ سمجھتے تھے.

قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ عربوں میں سودخوری کا رواج ''یہودیوں'' نے ڈالا تھا۔ اور انہوں نے عربوں کو بتلایا کہ یہ ایک بڑا نفع بخش کاروبار ہے۔ چنانچہ جن علاقوں میں یہودی آباد تھے' مثلاً مدینہ منورہ' خیبر' تیماء اور یمن وہاں زیادہ تر سودی کاروبار یہودی ساہوکاروں ہی کے ہاتھ میں تھا' باقی علاقوں میں عرب اس معاملے میں خود مختار تھے.

خود مکہ مکرمہ میں یہ کاروبار زوروں پر تھا...... حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب زمانۂ جاہلیت میں اس کاروبار سے نفع کمانے والے تاجروں میں شمار ہوتے تھے...... ان کی طرف سے سود کے ''ھدر'' (ختم) کرنے کا اعلان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع کے اپنے تاریخی خطبے میں فرمایا' اسی طرح دوسرے عرب سردار بھی اس کا

کاروبار کو ترقی اور خوش حالی کا ذریعہ سمجھتے تھے' چنانچہ ان کا یہ قول قرآن مجید میں نقل کیا گیا ہے:

اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا — اس کے سوا نہیں کہ ''بیع'' تو ربوا (سود) کی طرح ہے۔

جس کا جواب ان الفاظ میں دیا گیا ہے:

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (۲۹) — اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔

نیز فرمایا:

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ (۳۰) — اللہ تعالیٰ ''سود'' کو مٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔

اس بارے میں قرآن مجید میں تین مقامات پر شدید ترین الفاظ میں اس عادت قبیح سے روکنے کے لیے آیات نازل کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک سورہ روم' دوسری سورہ آل عمران اور تیسری سورۃ البقرہ ہے۔ (۳۱) جبکہ احادیث نبویہ میں بھی اس عنوان پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

2 ___ تاجرانہ قباحتیں:

چونکہ شہری لوگ' بالخصوص اہل مکہ صدیوں سے ''تجارت پیشہ'' تھے' اس لیے مرور ایام سے' ان میں بہت سی برائیاں اور قباحتیں پیدا ہوگئیں تھیں' جن سے قرآن مجید اور احادیث نبویہ میں روکا گیا ہے' جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

(ا) کم تولنا اور کم ماپنا:

بعض تاجر کم تولنے اور کم ماپنے کے مذموم مرض میں مبتلا تھے۔ اسی لیے جب انہوں نے کسی سے لینا ہوتا' تو زیادہ لیتے اور جب دینا ہوتا تو کم تولتے تھے۔ اس مذموم عادت سے انہیں روکنے کے لیے سورۃ المطففین نازل ہوئی' جس میں بطور خاص یہ کہا گیا:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ٥ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ٥ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ٥ (۳۲)	ہلاکت ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے جو لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیتے ہیں۔

(ب) ذخیرہ اندوزی:

ہر تاجر قوم جب آہستہ آہستہ ناجائز منافع خوری کی طرف بڑھتی ہے' تو وہ تمام ہتھکنڈے اپنا لیتی ہے' جو قدیم زمانے سے ناجائز منافع خوری کے لیے موزوں سمجھے جاتے رہے ہیں' ایسے طریقوں میں ایک طریقہ ''ذخیرہ اندوزی'' کا بھی ہے' بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ عربوں میں ''ذخیرہ اندوزی'' (احتکار) کا مرض بھی موجود تھا' اور اسلام نے لوگوں کو اس سے منع کر دیا۔ چنانچہ ترمذی شریف میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یحتکر الا خاطئ (۳۳)	نہیں ذخیرہ اندوزی کرتا' مگر وہ شخص وہ خطا کار ہو۔

(ج)۔ بیع تلقی رکبان:

کچھ لوگ زیادہ منافع کمانے کے لیے ''تلقی رکبان'' کا طریقہ اپناتے تھے' جس کی صورت یہ تھی کہ اگر باہر سے کوئی قافلہ (یا کوئی فرد) مال تجارت لے کر شہر میں جاتا' تو وہاں کے لوگ اس کو بتلاتے کہ جو اشیا وہ لے کر آیا ہے' ان کی شہر میں قیمت بہت کم ہے اور پھر اس قافلے والوں سے وہ شے اونے پونے خرید کر شہر میں منہ مانگے داموں پر فروخت کرتے تھے' چونکہ اس میں واضح دھوکہ اور فراڈ تھا' اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ (۳۴)

عرب میں بیع کی بعض صورتیں قمار (جوئے) سے مشابہہ تھیں۔ جب اسلام میں جوئے کی ممانعت آئی' تو ان صورتوں سے روک دیا گیا۔

ایسی صورتوں میں ایک صورت ''بیع الحصاۃ'' کی تھی' جس کی صورت یہ تھی کہ

بائع مشتری کو اختیار دے دیتا کہ وہ متعدد اشیا میں سے جس شے پر کنکری پھینک دے گا' وہ اس کی ہو جائے گی۔(۳۵)

ایک اور صورت بیع الملامسۃ کی تھی' جس میں کنکری پھینکنے کے بجائے' ہاتھ لگانا ضروری ہوتا تھا۔ غرض یہ کہ اسلام نے ان تمام صورتوں کو ممنوع قرار دے دیا(۳۶)' جن میں کسی ایک طرف دھوکہ یا جہالت پائی جاتی تھی۔(۳۷)

(ج) چوری اور ڈکیتی:

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ''جزیرۂ عرب'' ایک ویران اور بنجر علاقہ ہے' جہاں اکثر قحط اور دوسری وبائیں آتی رہتی ہیں...... بجائے اس کے کہ اہل عرب باقاعدہ کسی پروگرام کے تحت' ان وقتی یا مستقل بلاؤں کا مقابلہ کرتے' ان میں سے بعض قبائل نے لوٹ مار، چوری اور ڈکیتی کو اپنا ذریعۂ معاش بنا رکھا تھا۔

لوٹ مار اور ڈکیتی کی وارداتیں انفرادی طور پر بھی ہوتی تھی اور اجتماعی طور پر بھی...... بعض قبائل بنوغفار وغیرہ اس کے بارے میں بہت بدنام تھے۔

اسی لیے دور جاہلیت میں ''حرمت والے مہینوں'' (اشہر حرم) اور علاقہ حرم کی بڑی اہمیت تھی۔ حرمت والے مہینوں میں ''عرب قبائل'' لوٹ مار اور قتل و خون ریزی سے اجتناب کرتے تھے اور پورے جزیرۂ عرب میں مجموعی طور پر مسافروں کو آمد و رفت کے لیے سازگار ماحول میسر ہوتا تھا...... ان مہینوں کی حرمت و تعظیم کے پیچھے ایک مذہبی جذبہ بھی کام کر رہا تھا اور وہ جذبہ ''حج بیت اللہ'' کے ادب و احترام کا تھا...... جبکہ ماہ رجب میں لوگ عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ حاضری دیا کرتے تھے۔ حرم اور اہل حرم کی اہمیت کی بنا پر تمام قبائل عرب انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کے قافلے لوٹے جانے سے محفوظ رہتے تھے...... اسی لیے قرآن کریم میں ہے:

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (۳۸)

کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے حرم کو ''امن'' والا بنا دیا ہے اور لوگ ان کے گرد و نواح سے اچک لیے جاتے ہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ٥ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (٣٩)

قریش مکہ کے مانوس کرنے کے سبب' (یعنی) ان کو سردی اور گرمی کے سفر سے مانوس کرنے کے سبب لوگوں کو چاہیے' کہ اس نعمت کے شکر میں اس کے گھر کے مالک کی عبادت کریں' جس نے ان کو بھوک میں کھلایا اور خوف سے امن بخشا۔

عربوں کی چوری اور ڈکیتی کی عادت کے متعلق مولوی ذکاء اللہ دہلوی کہتے ہیں:

''ریگستان میں جو کارواں جاتے تھے' جب تک وہ فدیہ نہ دے دیتے' بدووں کے ہاتھ سے بچ نہ پاتے تھے...... اگر بدو دور سے دیکھتا کہ مسافر اکیلا جا رہا ہے' تو وہ اس پر لپک کر چھپٹتا اور اس کو ڈانٹ کر کہتا تھا...... کہ تیری چچی (بدو کی بیوی) ننگی بیٹھی ہے' لہٰذا تو کپڑے اتار دے' اگر تو مسافر نے چپ چاپ کپڑے اتار دیئے تو خیر ورنہ دو بدو مقابلہ ہوتا تھا' ایک شخص یا دو اشخاص مل کر چوری کرتے' تو وہ بدنام ہوتے تھے' لیکن اگر گروہوں کی صورت میں پورا مجمع مل کر چوری کرتا' تو اسے جائز سمجھا جاتا تھا' اور اس کو ''محاربہ'' کہا جاتا تھا''۔ (٤٠)

ان حالات میں جب عرب میں اسلام کا سورج طلوع ہوا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی (عدی رضی اللہ عنہ بن حاتم) سے فرمایا کہ ''ایک وقت آئے گا کہ ایک تنہا عورت مکہ سے حیرہ تک سفر کرے گی اور اس کو خدائے واحد کے سوا کسی سے کوئی ڈر نہ ہوگا'' تو انہیں سن کر بڑا تعجب ہوا تھا۔

جاہلی شعرا اس بات پر فخر کا اظہار کرتے تھے کہ وہ جس قبیلے کے رکن ہیں' وہ دوسروں سے مال لوٹ سکتے ہیں' کوئی دوسرا ان کا مال نہیں لوٹ سکتا...... چنانچہ دیوان حماسہ میں جو پہلا قصیدہ ہے' اس کا یہی موضوع ہے...... شاعر قریط بن انیف کے تین اونٹ بنو ذھل نے لوٹ لیے اور اس کی قوم اس کی مدد کو نہ آئی' اس پر شاعر کہتا ہے:

لو کنت من مازن لم تسبح ابلی — بنو اللقیطة من ذھل بن شیبانا
اذاً لقام بنصری معشر خشن — عند الحلیفة ان ذولوثة لانا
لا یسالون اخاھم حین یندبھم — فی النائبات علی ماقال برھانا
فلیت لی بھم قوماً اذا رکبوا — شدّوا الاغارة فرساناً ورکبانا (۴۱)

(اگر میں قبیلہ ''بنو مازن'' میں سے ہوتا تو میرے اونٹ بنولقیطہ' یعنی ذھل بن شیبان کے لوگ لوٹ کر نہ لے جاتے...... پس کاش مجھے میری قوم (جو انتہائی نرم دل لوگ ہیں) کے بدلے ایسی قوم مل جائے' جو گھوڑوں یا اونٹوں پر سوار ہونے کے بعد' خوب غارت گری کریں).

(د) قتل و غارتگری:

جاہلی معاشرے میں انسانی جان کی کوئی وقعت نہ تھی...... لوگ معمولی باتوں پر ایک دوسرے کو قتل کر دیتے تھے اور اس پر فخر کا اظہار کیا جاتا تھا۔ عام طور پر ایک قتل کے بعد' جوابی قتل کا اور پھر قتل و غارتگری کا لامتناہی سلسلہ چل نکلتا تھا...... مشہور عربی شاعر امرؤالقیس کے متعلق تمام مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس نے اپنے باپ کے قتل کے بعد یہ قسم کھائی تھی:

''وہ جب تک بنو اسد کے سو آدمیوں کو قتل اور سو کے سر مونڈھ کر انہیں اچھی طرح ذلیل و رسوا نہ کر لے گا' اس وقت تک نہ تو گوشت کھائے گا... نہ شراب پیے گا اور نہ سر میں تیل ڈالے گا''

چنانچہ اس نے اپنی بعد کی پوری زندگی اپنی اس ضد کی تکمیل میں بسر کر دی اور کئی بے گناہ لوگ اس قتل و غارتگری کا شکار ہوئے۔

عرب کی مشہور جنگ ''جنگ بسوس'' کے متعلق بیان کیا جاتا ہے' کہ یہ جنگ کم وبیش چالیس سال تک جاری رہی' یہ جنگ ایک معمولی سے واقعے سے شروع ہوئی تھی اور پھر سیکڑوں لوگ اس کی بھینٹ چڑھ گئے۔

قتل و خون ریزی کے متعلق قدیم عربوں کے خیالات کا ان کی شاعری سے

بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ السموٴال بن عادیا ایک یہودی رئیس' اپنے ایک قصیدے میں کہتا ہے:

وانا لقوم مانری القتل سبّةً — اذا ماراته عامر و سلول
یقرب حب الموت آجالنا لنا — وتکرهه اجالهم و تطول
ومامات منا سید حتف انفه — ولاطل منا حیث کان قتیل
تسیل علی حد الظباۃ نفوسنا — ولیست علی غیر الظباۃ تسیل (۴۲)

(ہم ایک ایسی جماعت کے لوگ ہیں' جو قتل ہونے کو عار اور ننگ نہیں سمجھتے' جیسا کہ بنو عامر اور بنو سلول ایسا سمجھتے ہیں؛ (۲) ہمارا موت کو محبوب سمجھنا ہماری موت کو ہم سے قریب لے آتا ہے جبکہ وہ موت سے گھبراتے ہیں' اس لیے لمبی عمریں پاتے ہیں؛ (۳) ہمارا کوئی سردار بستر پر لیٹ کر نہیں مرا اور ہمارا کوئی مقتول ایسا نہیں' جس کا بدلہ نہ لیا گیا ہو؛ (۴) ہمارا خون تلواروں کی دھاروں پر بہتا ہے اور تلواروں کے سوا کسی اور شے پر نہیں بہتا)۔

(5) فحاشی وعریانی:

قدیم عربوں کے متعلق قبائل میں خصوصاً شہری قبائل میں دوسری باتوں کے علاوہ فحاشی بھی عام تھی ..... یا کم از کم اس پر کوئی روک ٹوک نہ تھی ..... عورتیں بن ٹھن کر' اپنے آپ کو دکھاتے ہوئے گھروں سے باہر نکلتی تھیں ..... چنانچہ ازواج مطہرات کے لیے حجاب کا حکم آیا تو اس میں یہ فرمایا گیا:

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی (۴۳)

اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور جس طرح (پہلے) جاہلیت کے دنوں میں اظہار زیب و زینت کرتی تھیں' اس طرح زینت نہ دکھاؤ۔

دور جاہلیت میں فحاشی اور عریانی کا یہ عالم تھا کہ رئیس الشعراء امرؤ القیس اپنے "سبعہ معلقی" قصیدے میں اپنی محبوبہ کے ساتھ گزاری ہوئی عیش و عشرت کی گھڑیوں کو نہایت فحش اور کھلے الفاظ میں بڑے فخر کے ساتھ اور مزے لے لے کر بیان کرتا

ہے۔ اس کا یہ قصیدہ اتنا مقبول ہوا کہ مشہور روایات کی رو سے' اسے استار کعبہ کے ساتھ آویزاں کر دیا گیا تھا.

بعض عربوں کے ہاں آزادی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے بدکاری کی بعض صورتوں کو ''نکاح'' کا سا درجہ دے رکھا تھا' چنانچہ مشہور محقق محمود آلوسی کے مطابق عربوں میں نکاح کے حسب ذیل طریقے رائج تھے:

(الف) سب سے بہتر اور عام طریقہ تو وہی تھا' جسے اسلام نے ایجاب وقبول کی شرائط کے ساتھ اپنایا ہے۔ اس طریقہ کار کی رو سے لڑکی کے رشتہ داروں سے اس کے رشتہ کے لیے رابطہ کیا جاتا تھا اور ان کی مرضی سے لڑکی کا نکاح کر دیا تھا.(۴۴)

قریش مکہ اور دیگر شرفاے عرب میں نکاح کا یہی طریقہ رائج تھا' اور شرفا کے ان خاندانوں میں بدکاری اور خاوند کی بیوی سے اور بیوی کی خاوند سے بے وفائی کو سخت معیوب سمجھا جاتا تھا...... چنانچہ کتب سیرت میں ہے کہ جب ''ہند بنت عتبہ'' (زوجہ ابی سفیان) نبی اکرم ﷺ کے دست مبارک پر بیعت ایمان کے لیے آئی اور آنحضور ﷺ نے اس سے ''زنا نہ کرنے کی بیعت لی'' تو اس نے کہا ''کیا کوئی شریف عورت ایسا کر سکتی ہے''.(۴۵)

(ب) نکاح کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ خاوند اپنی بیوی سے کہتا: جب تو حیض سے پاک ہو جائے تو فلاں شخص کو بلا بھیجنا اور اس سے مباشرت کی درخواست کرنا' تاکہ تجھے اس سے حمل قرار پا جائے...... اس عرصے کے بعد وہ بیوی کے پاس جاتا رہتا...... اس تمام کاروائی کا مقصد یہ تھا کہ ''بچہ'' نجیب الطرفین پیدا ہو...... اس نکاح کو ''نکاح الاستبعاض'' کہا جاتا تھا.

(ج) نکاح کا ایک اور طریقہ یہ تھا کہ کچھ لوگ جن کی تعداد دس سے کم ہوتی تھی کسی ایک عورت کے پاس (باری باری) جاتے اور اس سے مباشرت کرتے۔ جب اس کو حمل ظاہر ہو جاتا اور اس کے بچہ پیدا ہوتا تو وہ ان تمام کو بلا بھیجتی ...... ان کی مجال نہ تھی کہ وہ نہ آتے...... ان سب کو بلا کر عورت جس کے نام سے چاہتی' اس لڑکے کو منسوب کر دیتی۔ اسے اس نسبت کو قبول کرنا پڑتا تھا...... البتہ لڑکی پیدا ہونے

کی صورت میں وہ اس نسبت کو قبول کرنے کا پابند نہ تھا۔

(د) بعض شہروں اور قصبوں میں ''پیشہ ور طوائفیں'' بھی ہوتی تھیں' جنہوں نے اپنے دروازوں پر جھنڈے لگا رکھے ہوتے تھے...... جب اس کے ہاں بچہ پیدا ہوتا' تو وہ ان تمام لوگوں کو بلا بھیجتی اور پھر کسی عراف (قیافہ شناس) کو بلایا جاتا۔ وہ بچے کے چہرے کے نقوش وغیرہ سے اندازہ لگا تا کہ وہ ان میں سے کس سے زیادہ مشابہ ہے' وہ جس کا نام لیتا...... اس سے اس کی نسبت ثابت ہو جاتی تھی...... ھشام بن الکلبی نے زمانہ جاہلیت کی دس طوائفوں کے نام گنوائے ہیں' جن میں سے ایک کا نام ام مہزول تھا۔ الکلبی کے مطابق ایک صحابی نے اس سے نکاح کرنا چاہا' تو سورہ نور (آیت۔۳) میں اسے اس سے روک دیا گیا۔

(ھ) ایک اور نکاح نکاح متعہ بھی تھا، جس کی رو سے ایک ''مدت مقررہ'' تک عورت سے نکاح کیا جاتا تھا' اس مدت کے گزرنے پر دونوں میں از خود جدائی ہو جاتی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دوٹوک لفظوں میں منع فرمایا ہے۔

(و) ایک اور طریقہ نکاح بدل کا تھا' اس طریقے کی رو سے ایک شخص دوسرے سے کہتا: ''تو میرے حق میں اپنی بیوی سے دستبردار ہو جا' میں تیرے حق میں اپنی بیوی سے دستبردار ہوتا ہوں''

(ز) ایک اور طریقہ نکاح شغار کا تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ کوئی شخص کہتا' کہ ''میں اپنی بیٹی کا تجھ سے اس شرط پر نکاح کرتا ہوں کہ تو اپنی بیٹی کا مجھ سے نکاح کر دے۔ اس میں مہر وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ (۴۶)

اسلام نے اس کو بھی ناجائز قرار دیا' جیسا کہ اوپر گزرا پہلے طریقے کے سوا کوئی طریقہ بھی اسلام میں جائز نہیں ہے۔

(6) ام الخبائث (شراب) کا استعمال:

عربوں کے قدیم جاہلی معاشرے میں ام الخبائث (شراب) کا استعمال بھی ایک وبا کی طرح موجود تھا۔ تمام لوگ یعنی' مرد عورتیں اور پیرو جوان بڑے شوق اور

بڑی رغبت سے اس کا استعمال کرتے تھے۔ شراب نوشی عربوں کی وہ کمزوری تھی جو غربت اور امارت دونوں حالتوں میں ان کے ساتھ رہتی تھی اور اسے پانی کی طرح پیا اور پلایا جاتا تھا...... چنانچہ مروی ہے کہ جب قرآن کریم میں شراب کی حرمت نازل ہوئی' تو صرف مدینہ منورہ میں اتنی شراب بہائی گئی' کہ اس کی تمام گلیوں میں پانی کی طرح شراب بہتی ہوئی نظر آتی تھی۔

شراب کی محبت اور اس کی چاہت کا مضمون ایسا ہے جسے اکثر شعراء اپنے کلام میں بڑے مزے لے کر بیان کیا ہے۔ عنترہ العبسی کہتا ہے:

ولقد شربت من المدامة بعد ما　　　رکد الهواجر بالمشوف المعلم

فاذا سكرت فانني مستهلك　　　مالي وعرضي وافر لم يكلم

(دوپہر کی تپش کی کم ہو جانے کے بعد' میں نے ٹھپہ لگائے ہوئے چمکدار دیناروں کے عوض شراب پی اور جب میں شراب پینے کے بعد مدہوش و مست ہو جاتا ہوں تو اپنے مال کو بے دریغ اڑاتا ہوں' مگر میری آبرو صحیح و سالم رہتی ہے)۔

چونکہ عربوں کے مزاج میں شراب رچی بسی تھی' اس لیے شراب نوشی سے ممانعت کا حکم چار مرحلوں میں آہستہ آہستہ کر کے نازل کیا گیا...... تاکہ عرب' اس حکم کی حکمت و ماہیت کو اچھی طرح جان سکیں، جبکہ باقی احکام اکثر ایک ساتھ نازل کیے گئے ہیں۔

پہلے مرحلے پر سورۃ النحل (پارہ ۱۴) میں بتایا گیا کہ انگوروں سے لوگ نشہ آور مشروب اور پاکیزہ رزق حاصل کرتے ہیں۔ (۴۷) دوسرے مرحلے پر سورۃ البقرہ (پارہ ۲) میں بیان کیا گیا کہ شراب اور جوئے میں فوائد اور نقصانات دونوں پائے جاتے ہیں' مگر ان کے نقصانات ان کے فوائد سے زیادہ ہیں۔ (۴۸)

تیسرے مرحلے پر سورۃ النساء (پارہ پنجم) میں حکم آیا کہ اوقات نماز میں شراب نوشی نہ کیا کرو۔ (۴۹)

چوتھے مرحلے پر سورۃ المائدہ (پارہ ہفتم) میں ارشاد ہوا کہ شراب اور جوا شیطانی اور پلید و نجس کام ہیں' لہٰذا ان سے مکمل طور پر بچو۔ (۵۰)

(7) توہم پرستی:

قدیم عربوں میں دوسری باتوں کے علاوہ توہم پرستی کا بھی عام رواج تھا۔ یہ لوگ بتوں کی پوجا کرتے' انہی سے مدد طلب کرتے اور مختلف رسوم کے ذریعے ان کے قرب کے خواہش مند رہتے تھے۔ یہ لوگ اپنی مرضی سے کچھ اشیاء کو حلال اور کچھ کو حرام سمجھتے۔ اللہ تعالیٰ کے ''خالق'' ہونے پر ان کا ایمان ضرور تھا' مگر اپنے اس عقیدے کو انہوں نے اس طرح سے بگاڑ رکھا تھا: کہ ان کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ تنہا نظام حکومت نہیں چلا سکتا' بلکہ اسے دنیا کا نظام چلانے کے لیے دوسروں کے تعاون اور ان کی مدد کی ضرورت ہے۔ اس لیے اپنے دیوتاؤں کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ یہ دیوی دیوتا انہیں خدا کا قرب عطا کرتے ہیں.

ان کے معبودوں کی اس فہرست میں ملائکہ سے لے کر انبیاء' شہدأ اور صالحین تک ہر طبقے کے نیک اور مقدس لوگ شامل تھے۔ فرشتوں کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا کہ وہ خدا کی (معاذ اللہ) بیٹیاں ہیں:

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ.	اور یہ لوگ اللہ کے لیے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں اور وہ ان سے پاک ہے اور اپنے لیے (بیٹے) جو مرغوب (وپسند) ہیں.

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہر بت پر ایک شیطان مقرر رہے' لہٰذا جو شخص اس بت کی پوجا کرے گا' شیطان کے حکم سے وہ اس کی حاجات پوری کرے گا .... ورنہ بصورت دیگر یہ شیطان اسے تکلیف پہنچائے گا.(۵۱)

ان کے مشرکانہ عقائد کی اساس اس بات پر تھی' کہ جو کچھ ہے' بس یہی دنیا ہے' اس کے بعد کچھ نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ان کی طرف سے کہا گیا ہے:

وَقَالُو مَاهِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ (۵۲)	اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو ۔۔ ہی کی ہے' کہ (یہیں) مرتے اور جیتے ہیں ۔ ہمیں تو (بس) زمانہ ہی مارتا ہے.

ان کے ان خیالات کا عکس ان کی شاعری اور ادب میں بھی نظر آتا ہے' مثلاً ایک شاعر کہتا ہے:

حیاۃ ثم موت ثم نشر　　　حدیث خرافۃ یا اُمّ عمرو

(زندگی' پھر موت' پھر جی اٹھنا...... اے ام عمرو یہ سب بے معنی باتیں ہیں)۔(۵۳)

ایک اور شاعر شداد بن الاسود بن عبد شمس نے جنگ بدر پر جو مرثیہ لکھا تھا' جس میں اس نے مرے ہوے رؤسائے قریش کی بے حد مدح سرائی کی تھی' اس کے آخری شعر میں وہ کہتا ہے:

یحدثنا الرسول بان سیحیا　　　وکیف حیاۃ اصداء وھام

(رسول ہمیں بتاتا ہے کہ ہم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوں گے' حالانکہ جو لوگ مرنے کے بعد اصداء اور ھام بن چکے ہیں' وہ کیسے زندہ ہوں گے)۔

بت پرستی کے علاوہ عرب میں سورج' چاند ستاروں' جنات اور اسی طرح مظاہر فطرت سے لے کر جانوروں وغیرہ تک کی پوجا کی جاتی تھی اور ان سب کو اللہ تعالیٰ کا شریک اور اس کا ساجھی سمجھا جاتا تھا۔(۵۴) اسلام نے ان تمام باطل تصورات کو ختم کیا اور ایک خدا کی عبادت اور اسی سے دعائیں اور حاجات مانگنے پر زور دیا۔

(8) کمزور عقائد:

باطل اور مہمل اشیاء کی عبادت اور پرستش کا لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کا عقیدہ کمزور ہو جاتا ہے اور وہ ذرا ذرا سی باتوں سے ڈرنے اور گھبرانے لگ جاتا ہے۔ اس کے ذہن اور دماغ پر ہر وہ شے اپنا تسلط جما لیتی ہے' جس میں ذرا سی مافوق البشری خاصیت پائی جاتی ہے اور وہ رسوم وقیود کا پابند ہو کر رہ جاتا ہے۔

ان کی توہم پرستی اور کمزور عقائد کا یہ شاخسانہ تھا کہ وہ ہر اس مقتول کے متعلق جس کا انتقام نہ لیا گیا ہو یہ سمجھتے تھے کہ اس کی روح الو (اصداء وھام) کی شکل اختیار کر کے سدا گھومتی اور پریشان حال پھرتی رہتی ہے اور جب اس کا انتقام لے لیا جاتا

ہے' تو اس کی روح اڑ کر وہاں سے چلی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک عرب شاعر کہتا ہے:

یا ام عمرو ان لا تدر شتمی و منقصتی   اضربک حتی تقول الھامة اسقونی (۵۵)

(اے عمرو اگر تو مجھے گالی دینا اور میری برائی کرنا بند نہیں کرے گی' تو میں تجھے ایسی مار ماروں گا' کہ تیرا ھامہ اسقونی اسقونی (مجھے خون پلاؤ مجھے خون پلاؤ) کہتا پھرے گا)۔

اسی طرح کا ایک وہم یہ تھا کہ انسان کے پیٹ میں ایک سانپ ہوتا ہے' جب بھوک لگتی ہے تو یہ سانپ اس کی پسلی کے کنارے اور جگر کو کاٹتا ہے۔ اسلام نے اس طرح کے تصورات اور عقائد کی نفی اور تردید کی ہے۔

اسی طرح ان کے ہاں ایک یہ بھی رسم تھی کہ جب کوئی شخص کسی بستی میں داخل ہونے کا ارادہ کرتا اور اسے وہاں کی وباء، یا جن کا خطرہ ہوتا تو داخل ہونے سے پہلے اس کے دروازے کھڑے ہو کر گدھے کی طرح رینگتا اور پھر اپنے گلے میں خرگوش کا ٹخنہ تعویز کے طور پر لٹکا لیتا۔ اسے نھیق اور تعشیر کہا جاتا تھا۔ ایک شاعر کہتا ہے:

قلبت ثیابی والظنون تحول بی   وترمی برجلی نحو کل سبیل (۵۶)

(میں نے اپنے کپڑے الٹ دیئے' جبکہ میرے گمان مجھے ادھر ادھر دوڑا رہے تھے اور میرے پاؤں کو ہر راستے کی طرف پھینک رہے تھے)۔

اسی طرح اگر کوئی شخص سفر کے لیے جاتا' تو ایک دھاگا درخت کی ٹہنی یا درخت کے تنے سے باندھ دیتا' جب وہ لوٹ کر واپس آتا تو اس دھاگے کو دیکھتا' اگر تو اسے اسی طرح پاتا' تو فبھا اور اگر وہ اسے کھلا ہوا پاتا' تو یہ سمجھ لیتا کہ اس کی بیوی نے خیانت کی ہے۔ اس رسم کو "رتم" کہا جاتا ہے۔ ایک عرب شاعر کہتا ہے:

ھل ینفعک الیوم ان ھمت بھم   کثرة ما توصی و تعقاد الرتم (۵۷)

(اگر عورت نے کسی بات کا ارادہ کر لیا ہو' تو تمہاری بہت سی نصیحتیں اور رتم باندھنا کوئی فائدہ نہ دے گا)۔

اسی طرح ایک رسم یہ بھی تھی کہ جب کسی بچے کا دانت گر جاتا' تو وہ اسے

انگوٹھے اور انگشت شہادت سے پکڑ کر' سورج کے طلوع ہونے کے وقت سورج کی طرف منہ کر کے پھینک دیتا اور کہتا "اے سورج اس کے عوض مجھے بہتر دانت دے...... جس میں تیری چمک بھی کارفرما ہو" طرفہ بن العبد اپنی محبوبہ کے دانتوں کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

سقته اياةُ الشمس الالساته　　اسف ولم تكلم عليه بالمد (٥٨)

(سورج کی شعاع نے اسے سیراب کیا ہے' سوائے اس کے مسوڑھوں کے' جن پر سرمہ چھڑکا گیا ہے اور پھر اس نے کوئی چیز نہیں چبائی).

اسی طرح کی ایک اور توہم پرستی یہ تھی کہ انہیں جب اندیشہ ہوتا کہ کسی شخص کو ارواح خبیثہ تکلیف پہنچائیں گی تو وہ اس کے گلے میں گندگی' مثلاً حیض سے آلودہ چھیتھڑے اور مردوں کی ہڈیاں ڈال دیتے...... ان کا یہ خیال تھا کہ یہ "تعویز" عشق کے سوا ہر بیماری کے لیے مفید ہے...... ایک اعرابی کہتا ہے:

يقولون علق يالک الخير رمة　　وهل ينفع التجنيس من كان عاشقا (٥٩)

(لوگ کہتے ہیں' کہ میں بوسیدہ رسی گلے میں ڈال لوں' تو مجھے فائدہ ہوگا کیا عاشق کو گندی اشیاء کا لٹکانا فائدہ دے سکتا ہے).

اسی طرح کی ایک توہم پرستی یہ تھی کہ جب کوئی شخص سفر سے واپس آتا' تو سیدھے دروازے سے آنے کی بجائے' وہ عقبی دروازے سے گھر کے اندر آتا تھا' اس رسم بد سے سورۃ البقرہ میں منع کیا گیا...... ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا (٦٠)

اور نیکی اس بات میں نہیں کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑے سے آؤ، بلکہ نیکی تو اس شخص کی ہے جو اللہ سے ڈرے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آیا کرو.

اسی طرح کی دیگر رسوم باطلہ ان میں پائی جاتی تھیں.

(9) قمار (جوا)

عربوں کے ہاں زمانہ جاہلیت میں جوا کھیلنا بڑے ہی ''فخر'' کی بات سمجھا جاتا تھا...... کیونکہ جوا ان ایام میں کھیلا جاتا جب سختی کا زمانہ ہوتا' دودھ معدوم ہو جاتا اور جاڑے کا دور دورہ ہو جاتا۔ ایک عرب شاعر کہتا ہے:

واذا تعذرت السواعد والتوات جال المغدی وسطها المضبوح

(یعنی جب دودھ کا ملنا مشکل ہو جائے تو ان کے درمیان جھلسا ہوا تیر دوڑنے لگتا ہے)

عربوں کے ہاں جوا...... کھیلنے کی کئی صورتیں رائج تھیں۔ زیادہ معروف صورت کو ''میسر'' کہا جاتا ہے' جس کی صورت یہ تھی کہ کچھ سخی اور مالدار لوگ اکٹھے ہو کر ایک اونٹنی خریدتے...... خواہ اس کی قیمت کتنی ہی زیادہ ہوتی' پھر ذبح کرنے والے (قدار) کو بلاتے' جو ذبح کرنے کے بعد گوشت کے دس حصے کر دیتا...... جس کے بعد جوے کے تیر (جن کو اقداح' ازلام اور اقلام کہتے تھے)، لائے جاتے۔ ان میں سات تیروں کے حصے ہوتے تھے' بشرطیکہ وہ جوئے میں کامیاب ہو جاتے' ورنہ انہیں دونا تاوان دینا پڑتا تھا اور تین تیروں کے حصے نہ ہوتے تھے۔ [٦١] قرآن مجید' سورۃ المائدہ میں اس کی حرمت نازل ہوئی اور اس سے لوگوں کو روک دیا گیا۔

(10) عہد کی پابندی:

عربوں میں اگرچہ ''پابندی عہد'' کے لیے سموال بن عادیا'' کی مثال مشہور تھی' جس نے اپنے عہد کو نباہنے کے لیے اپنے حقیقی بیٹے کو قربان کر دیا تھا...... لیکن ''پابندی عہد'' کی مجموعی حالت اچھی نہ تھی...... بعض خاندان اور بعض لوگ اپنے عہد کی پابندی جان پر کھیل کر کرتے تھے' مثال کے طور پر سفر ہجرت میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے راستے کی رہبری کے لیے جس کافر'' عبداللہ بن اریقط'' سے معاہدہ کیا تھا' اس نے انعام کی رقم کے باوجود' جو کفار مکہ نے نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اطلاع دینے کے لیے مقرر کی تھی' اپنے عہد کی پابندی کی اور

دشمنوں کو آنحضرت ﷺ کے سفر کی خبر نہ ہونے دی.

لیکن عرب کے اکثر قبائل اس بارے میں کسی اخلاقی ضابطے کے پابند نہ تھے. چنانچہ سورۃ التوبہ میں اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ (۶۲)	بھلا مشرکوں کے لیے (جنہوں نے) عہد توڑ ڈالا خدا اور اس کے رسول کے نزدیک عہد کیونکر قائم رہ سکتا ہے۔ ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد محترم (خانہ کعبہ) کے پاس عہد کیا ہے، سو اگر وہ اپنے عہد پر قائم رہیں، تو تم بھی عہد کی پابندی کرو.

اس کے بعد فرمایا:

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (۶۳)	یہ لوگ کسی مومن کے حق میں رشتہ داری اور عہد کا لحاظ نہیں رکھتے ....

جس سے واضح ہوتا ہے کہ عربوں کی اکثریت اپنے وعدوں کی پابندی کا بھی خیال نہ رکھتی تھی.

(11) لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا:

عربوں کی اخلاقی پستی کا مظہر، ان کی ایک اور رسم، بچیوں کو زمین میں زندہ دفن کرنے کی تھی۔ ھیثمہ بن عدی نے المیدانی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ واد (بچیوں کو زندہ دفن کرنے) کا تمام قبائل عرب میں رواج تھا، یہ الگ بات ہے کہ اگر ایک شخص ایسا کرتا تو دس چھوڑ بھی دیا کرتے تھے، ماسوا بنو تمیم کے .... کہ ان میں اسلام سے قبل یہ رسم بہت زیادہ تھی.

اس رسم بد کی وجہ سے مختلف قبائل میں مختلف تھی:

بعض قبائل محض مردانہ غیرت و حمیت کی بنا پر ایسا کرتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ جب یہ لڑکی بڑی ہو جائے گی، تو یہ ہمارے لیے "غیرت" کا باعث بنے گی۔ اس لیے اس کو بچپن ہی میں قتل کر دیا جائے۔ اس ضمن میں بلوغ الارب میں بنو ربیعہ کے

متعلق (اور بنوتمیم کے بارے میں) ایک طویل روایت نقل کی گئی ہے جس میں بتلایا گیا ہے کہ اس رسم بد کی ابتدا کیسے ہوئی۔ اس روایت کی رو سے ایک مرتبہ ایک دشمن قبیلہ ان کے قبیلے کے سردار کی بیٹی کو اٹھا کر لے گیا...... صلح کے بعد قید کرنے والے نے لڑکی کو اختیار دے دیا کہ وہ اپنے والد (بنوتمیم کی روایت کی رو سے اپنے خاوند) اور قید کرنے والے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے، جس پر اس نے اپنے قید کرنے والے کا انتخاب کر لیا...... چونکہ یہ واقعہ سردار (اور قبیلے) کی رسوائی اور فضیحت کا باعث بنا تھا' اس لیے اس نے قسم کھائی کہ وہ آئندہ اپنی لڑکیوں کو بچپن ہی میں مار دیا کرے گا۔ چنانچہ بنوتمیم کے سرار (قیس بن عاصم) کے متعلق مروی ہے کہ اس نے اس حلف کے بعد دس سے زیادہ لڑکیوں کو زندہ درگور کیا۔ (۶۴)

اس کی ایک اور وجہ ''افلاس'' اور غربت بھی تھی' اس لیے قرآن مجید میں بار بار یہ حکم آیا:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۔ اور اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشے سے قتل نہ کرو'
نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (۶۵) ۔ ہم ہی انہیں روزی دیتے ہیں اور تم کو بھی۔

چونکہ عربی معاشرہ ایک ''مردانہ معاشرہ'' تھا جس میں مردوں کو فخر، بڑائی اور ''حسن تقدیر'' کی علامت سمجھا جاتا...... جبکہ لڑکیاں صرف کھانا بنانے یا گھر سنبھالنے کے لیے ہوتی تھیں۔ اس لیے بعض عرب قبائل انہیں خود پر معاشی بوجھ سمجھتے تھے۔

لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا طریقہ بھی دل چسپ تھا:

''جب کسی شخص کے ہاں لڑکی پیدا ہوتی اور وہ اسے زندہ رکھنا چاہتا' تو اسے ''صوف'' یا اون کا جبہ پہنا دیتا۔ یہ لڑکی جنگل میں اونٹ اور بھیڑ بکریاں چراتی رہتی...... اور اگر مار ڈالنا چاہتا تو اسے چھوڑ دیتا' یہاں تک کہ جب وہ چھ سال کی ہو جاتی تو وہ اس کی والدہ سے کہتا کہ اسے خوشبو لگا دو اور تیار کر دو تا کہ میں اسے لے کر اس کے سسرال چلا جاؤں۔ اس نے صحراء میں اس کے لیے گڑھا پہلے ہی کھود رکھا ہوتا تھا...... پھر وہ اسے لے کر گڑھے پر پہنچتا اور اسے کہتا گڑھے میں

جھانکو جب وہ جھانکتی تو وہ اسے گڑھے میں دھکا دے کر گرا دیتا اور گڑھے میں مٹی ڈال کر اسے ہموار کر دیتا۔ (٦٦) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایسے عرب قبائل میں جب حاملہ عورت کے بچہ جننے کا وقت آتا تو وہ گڑھا کھود لیتی اور اس کے قریب آ جاتی اگر لڑکی پیدا ہوتی تو اسے گڑھے میں ڈال کر مٹی ڈال دی جاتی اور لڑکا ہوتا تو اسے زندہ رہنے دیا جاتا۔'' (٦٧)

لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا' ایسا نہ تو ہر لڑکی کے متعلق ہوتا تھا اور نہ ہر باپ ایسا کرتا تھا۔ یہ رواج عرب کے چند قبائل مثلاً بنو ربیعہ' کندہ اور بنو تمیم وغیرہ تک محدود تھا اور ان میں سے بھی گنے چنے لوگ ایسا کرتے تھے۔

اس کے ساتھ ہی ایسے لوگ بھی تھے' جو اس رسم بد سے لوگوں کو بچانے کے مساعی جمیلہ میں مصروف رہتے تھے' چنانچہ بخاری شریف میں زید بن عمرو بن نفیل کے متعلق (بعض دیگر مصادر میں صعصعہ بن ناجیہ کے متعلق) مروی ہے کہ یہ حضرات لڑکی کے باپ سے اس کی لڑکی کی کفالت کا انتظام کر کے اسے خرید لیتے تھے اور لڑکی کے بالغ ہونے تک اس کا خرچہ بھیجتے رہتے تھے۔ اس طرح ان کی کوششوں سے بہت سی لڑکیاں زندہ درگور ہونے سے بچ گئیں۔ قرآن مجید میں اس رسم بد کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ○ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ○ (٦٨)

اور جب اس کی لڑکی سے جو زندہ دفن کر دی گئی تھی پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ میں ماری گئی تھی۔

(12) دیانت وامانت:

جزیرۂ عرب میں دیانت وامانت کی حالت میں ناگفتہ بہ تھی...... اگرچہ لوگ دور جاہلی میں بھی ''امانت و دیانت'' میں مشہور تھے' لیکن اکثریت کا حال ایسا ہی تھا۔

قرآن مجید میں اہل کتاب کے متعلق جو باقی معاشرے سے نسبتاً پڑھے لکھے اور مہذب تھے' یہ بتلایا گیا ہے:

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا (۶۹)	اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا ہے کہ اگر تم اس کے پاس روپوں کا ڈھیر امانت رکھ دو تو وہ تم کو فوراً واپس کر دے گا اور کوئی ایسا ہے کہ اگر تم اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھ دو تو جب تک اس کے پر ہر وقت کھڑے نہ رہو' تمہیں دے گا ہی نہیں.

امانت و دیانت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی شہرت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں لوگوں کی امانتوں کے ڈھیر کا جمع ہونا بھی اس بات کی شہادت ہے کہ جاہلی معاشرے میں امانت و دیانت کی حالت تسلی بخش نہ تھی.

(13) معاشرتی اور سماجی اونچ نیچ:

عربوں کے قدیم معاشرے کی ایک نمایاں ترین خصوصیت اس میں ''معاشرتی تفاوت'' بھی تھا' ان کے ہاں انسانوں کی دو اقسام تھی ..... ایک قسم امیر اور دوسری قسم غریب اور مفلس لوگوں پر مشتمل تھی۔ غریبوں اور مفلسوں کو بہت کم معاشرتی حقوق حاصل تھے۔ امیر لوگ ان کے پاس بیٹھنا اور انہیں خوشیوں میں شریک کرنا...... یا ان کے دکھ درد کو بانٹنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ اسی لیے چند مواقع پر' جب سرداران قریش کو اسلام کی باتیں سننے کے لیے بلایا گیا' تو ان کی اولیں شرط یہ ہوتی تھی کہ وہ کسی غریب اور مفلس مسلمان کے پاس نہ بیٹھیں گے...... بالفاظ دیگر ان کی شرط یہ تھی کہ وہ فقط اسی صورت میں اسلام کی دعوت سننے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس سے غریب اور قلاش مسلمانوں کو اٹھا دیں .....مگر قرآن مجید میں آپ کو اس شرط کی تعمیل سے سختی کے ساتھ روک دیا گیا۔ ایک موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ	اور جو لوگ صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور اس کی رضا مندی کے طالب رہتے ہیں۔ ان کو اپنے پاس سے مت نکالو! ان کے حساب (اعمال)

شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ (۷۰) کی جواب دہی تم پر کچھ نہیں اور تمہارے حساب کی جواب دہی ان پر کچھ نہیں' پس ایسا نہ کرنا اور اگر ان کو نکالو گے' تو ناانصافوں میں ہو جاؤ گے.

اس حکم کی وجہ یہ تھی کہ انسانی اخوت و مساوات کا نظریہ اسلام کے اساسی اصول و قواعد میں سے ہے' اگر کوئی شخص اس اصول کی نفی کر دے تو اس نے گویا بحیثیت مجموعی اسلام کی نفی کر دی' اسی لیے ان لوگوں کی اس شرط کو پورا نہ کرنے کی تاکید فرمائی گئی.

یہ معاشرتی اونچ نیچ اتنی زیادہ تھی' کہ ''ابو جہل'' کو مرتے وقت اس بات کا افسوس تھا' کہ اسے کسان کے دو بیٹوں نے قتل کیا ہے' گویا اس کے نزدیک اس کا قتل کسی معزز شخص کے ہاتھوں ہونا چاہیے تھا.

حوالہ جات وحواشی

(۱) تاریخ ادب عربی از حسن زیات' اردو ترجمہ از عبدالرحمٰن سورتی مطبوعہ لاہور' ص ۳۸۔

(۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ' مقالہ العرب (۱۳:۵ از G.Kents)۔

(۳) مولوی ذکاء اللہ دھلوی: عرب قبل از اسلام' ص ۵۸' کراچی ۱۹۴۶ء۔

(۴) Kent مقالہ عرب' در اردو دائرہ معارف اسلامیہ' ۱۳: ۵۹۔۶۰' مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

(۵) ذکاء اللہ خان دھلوی: عرب قبل از اسلام' ص ۵۹۔۶۲۔

(۶) (R.B.Sc/M.A.C) مقالہ Arab' در Encyclopaedia Brittanica مطبوعہ ۱۹۵۰ء' ۱:۱۰۴۶۔۱۰۴۹' ایڈیشن ۱۹۷۵ء۔

(۶۔الف) قوم عاد قدیم اقوام سے ایک تھی' یہ قوم علاقہ "ثمود" کے قریب موجودہ سعودی عرب میں' حجاز کے بالائی علاقے میں آباد تھی۔ ان کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو بطور رسول بھیجا گیا' مگر انہوں نے ان کی بات پر کان نہیں دھرے' تو اللہ تعالیٰ نے انہیں آندھی کے عذاب کے ذریعے تباہ فرما دیا...... ان کا زمانہ اندازاً تین ہزار ق م بیان کیا جاتا ہے..... (اردو دائرہ معارف اسلامیہ' بذیل مادہ۔ عاد)۔

(۶۔الف) قوم ثمود بھی قدیم زمانے کی اقوام سے ایک ہے' جنہیں اللہ تعالیٰ نے' ان کی نافرمانی کے باعث ہلاک کر دیا تھا۔

یہ قوم وادی القریٰ' علاقہ الحجر کے قریب آباد تھی۔ ان کا تذکرہ عہد سرجون دوم کی آشوریوں کی تحریرات' ۸ ق م میں بھی ملتا ہے' اس کے علاوہ یونانی اور رومانی تاریخوں میں ان کا تذکرہ موجود ہے' ان کی طرف حضرت صالحؑ کو نبی بنا کر بھیجا گیا' مگر انہوں نے انہیں جھٹلا دیا' تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فنا کے گھاٹ اتار دیا (دائرۃ المعارف عربی:

بذیل مادہ)۔

(٦۔الف) طسم و جدیس، عرب کے قدیم عمالقہ سے نسبی تعلق رکھنے والے قبیلے تھے، جو البحرین، یمامہ اور الاحقاف میں آباد تھے۔ روایات کے مطابق قبیلۂ طسم کے حکمران (عملوق) نے جدیسی عورتوں کے ساتھ بدسلوکی کی، جن پر اس سے جنگ چھڑ گئی، اور جدیسیوں نے اس کے پورے قبیلے (طسم) کو موت کے گھاٹ اتار دیا، البتہ ایک شخص اس قتل عام سے بچ گیا، جس نے یمن کے حکمران (تبع) کو اس قتل عام سے باخبر کیا، اس نے اس قبیلے (جدیس) پر حملہ کر کے اس کے تمام افراد کو ہلاک کر دیا۔ اس طرح تقریباً ٢٥٠ ق م میں یہ دونوں قبیلے صفحۂ ہستی سے نابود ہو گئے (المنجد، الاعلام، بذیل مادہ)۔ صاحب لسان کے مطابق یہ لوگ عاد اولیٰ سے مناسبت رکھتے تھے (لسان، ١/٢٠٧)۔

(٧) شبلی نعمانی: سیرۃ النبی، ١:١٠٨۔١٠٩، مطبوعہ اعظم گڑھ۔

(٨) حسن زیات: تاریخ ادب عربی، ص ٣٧۔٣٩، مطبوعہ لاہور۔

(٩) ایضاً، ص ٣٦، ٣٧۔

(١٠) دیوان الحماسہ، باب الحماسہ، مطبوعہ لاہور، ص ٣٠۔٣٣۔

(١١) تاریخ ادب عربی، ص ٤١۔

(١٢) الآلوسی، بلوغ الارب، ٣:٤٧۔٧٧۔ (اردو ترجمہ)

(١٣) سیرت ابن ہشام، مطبوعہ قاہرہ، ص ٧٦۔

(١٤) ایضاً، تاریخ ادب عربی، ص ٤٠۔٤١۔

(١٥) بلوغ الارب، ٣:١٨٣۔١٨٤

(١٦) نیز دیکھیے راقم الحروف کا مقالہ نصاریٰ در اردو دائرہ معارف اسلامیہ بذیل مادہ۔

(١٧) بلوغ الارب، ٢:١٥٠۔١٥١۔

(١٨) تفسیر الطبری، بذیل تفسیر سورۃ البقرۃ، آیت لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔

(١٩) مقالہ یہود، در اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ٢٣:٣٦٠۔

(٢٠) ایضاً۔

(٢١) الجاثیہ (٤٥:٢٤)۔

(۲۲) بلوغ الارب‘ ۳:۱۱۵۔۱۱۸.

(۲۳) ابن قتیبہ: المعارف‘ طبع Wustenfeldt‘ بیروت.

(۲۴) تفصیل کے لیے دیکھیے ابن قتیبہ المعارف.

(۲۵) تاریخ ادب عربی‘ ص ۴۲.

(۲۶) احمد امین: تاریخ ادب عربی‘ ص ۱۵۲۔۱۵۳.

(۲۷) مقدمہ ادبیات عرب‘ مترجمہ اولاد علی گیلانی‘ ص ۲۶.

(۲۸) ایضاً.

(۲۹) البقرہ (۲/۲۷۴-۲۷۵).

(۳۰) ایضاً (۲/۲۷۶).

(۳۱) المطففین‘ (۸۳/۱۔۳).

(۳۲) الترمذی‘ ابواب البیوع‘ ۱:۲۳۹).

(۳۳) البخاری‘ کتاب البیوع‘ باب ۶۴‘ ۶۸‘ ۷۱؛ مسلم‘ کتاب البیوع‘ حدیث ۱۱‘ ۱۳۲‘ ۱۴۷ وغیرہ

(۳۴) البخاری‘ کتاب البیوع‘ (حدیث ۲).

(۳۵) البخاری‘ کتاب البیوع‘ باب ۳۴‘ ۶۳‘ ۹۳.

(۳۶) ابو داؤد‘ کتاب البیوع‘ باب ۲۴ وغیرہ.

(۳۷) العنکبوت (۲۹:۶۵).

(۳۸) القریش (۱۰۶:۱۔۴).

(۳۹) عرب قبل از اسلام‘ ص ۸۲).

(۴۰) دیوان الحماسہ‘ ص ۲۔۳.

(۴۱) دیوان حماسہ‘ ص ۲۴۔۲۵.

(۴۲) الاحزاب‘ (۳۳:۳۳)

(۴۳) بلوغ الارب‘ بمحل مذکور)

(۴۴) ابن حجر العسقلانی‘ الاصابہ‘ ۴/۲۲۵‘ عدد ۳.۱۱‘ مطبوعہ احیاء التراث العربی‘ بیروت‘ (لبنان.

(۴۵) بلوغ الارب‘ ۲:۲۶۲۔۲۶۵.

(۴۶) النحل..... (۱۶:۵۷).

(۴۷) البقرہ' ۲/۲۱۹.

(۴۸) النسآء' (۴/۴۵).

(۴۹) المائدہ' ۵/۸۹۔۹۰.

(۵۰) بلوغ الارب (۳:۲۹).

(۵۱) الجاثیہ (۴۵:۲۴).

(۵۲) بلوغ الارب' ۳:۷۱).

(۵۳) ایضاً' ۳/۱۰۰'۱۰۱'۱۰۹'۱۱۷.

(۵۴) ایضاً' ۳/۲۲۳۔۲۷۳.

(۵۵) ایضاً' ۳/۳۱۰.

(۵۶) ایضاً' ۳/۳۱۲.

(۵۷) ایضاً' ۳/۳۱۴.

(۵۸) بلوغ الارب' ۳:۳۱۸:۳۱۹.

(۵۹) البقرہ (۲:۱۸۹).

(۶۰) بلوغ الارب' ۳:۵۴۵۔۵۶۵.

(۶۱) التوبہ (۹:۷).

(۶۲) ایضاً (۹:۱۰).

(۶۳) بلوغ الارب' ۳:۵۲۳۔۵۲۴.

(۶۴) بنی اسرائیل (۱۵:۳۱).

(۶۵) بلوغ الارب' ۳:۵۲۴۔۵۲۵.

(۶۶) ایضاً.

(۶۷) التکویر (۸۱۔۸۔۹).

(۶۸) آل عمران (۳:۷۵).

(۶۹) الانعام (۶:۵۲).

باب 2

خاندان قریش کے مورث اعلیٰ

حضرت ابراہیم علیہ السلام

دنیا میں ہر شے اپنی اصل سے پہچانی جاتی ہے..... حتی کہ بازار میں فروخت ہونے والی اشیاء تک کے بارے میں یہ استفسار کیا جاتا ہے کہ یہ کس ملک اور کس مصنع (فیکٹری) کی بنی ہوئی ہیں..... اس لیے ''خاندان قریش'' کی اصلیت کا مسئلہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔

قرآن کریم میں کئی مقامات پر یہ صراحت کی گئی ہے کہ خاندان قریش کے مورث اعلیٰ سیدنا ابراہیم خلیل اللہ ہیں' مثال کے طور پر سورۃ الحج میں ارشاد ہے:

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ط (۱)

یہ تمہارے جد امجد ابراہیم کا طریقہ ہے' اسی نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔

گویا رسول اللہ ﷺ نہ صرف نسبی اور خاندانی اعتبار سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وارث ہیں' بلکہ روحانی اور فکری اعتبار سے بھی آپؐ ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام...... کے جانشین اور ان کی فکر کے وارث ہیں...... ایک اور مقام پر آنحضور ﷺ اور آپؐ کی بعثت مبارکہ کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام دونوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ انہوں نے تعمیر خانہ کعبہ کے وقت یہ دعا کی تھی:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ (۲)

اے ہمارے پروردگار! اور ان (ہماری اولاد) میں (ایسا) رسول بھیج جو ان کو تیری آیات سنائے' انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کے (دلوں اور زندگیوں) کو پاک کرے۔

خود رسول اللہ ﷺ نے بھی کئی موقعوں پر اس بات کو واضح فرمایا کہ آپ ﷺ ہی سیدنا ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کے عظیم القدر سلسلے کے وارث ہیں اور آپ ہی حضرت ابراہیم کی دعاؤں کا مصداق ہیں' چنانچہ ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

نعم انا دعوة ابراهيم وبَشَّر بی عیسٰی بن مریم (۳) ہاں میں ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا مصداق ہوں اور میرے متعلق ہی' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی تھی.

ایک اور موقع پر جب لوگوں نے قربانی کے متعلق استفسار کیا کہ یہ کیا ہے؟ تو فرمایا:

سُنَّةُ ابیکم ابراهیم...... (۴) یہ تمہارے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے.

الغرض قرآن وسنہ کے واضح نصوص اور قدیم عربوں کی روایات اس بات پر متفق ہیں کہ قریش مکہ اور عرب کے دوسرے بہت سے خاندانوں کا نسبی سلسلہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وساطت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جا ملتا ہے.

اس تفصیل سے ''اہل مغرب'' کے اس تعصّب کی قلعی کھل جاتی ہے' جو انہیں آنحضور ﷺ سے خصوصی طور پر ہے جس کی بنا پر انہوں نے آنحضور ﷺ کی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نسبت کے متعلق شکوک وشبہات کا اظہار کیا ہے' مثال کے طور پر سر ولیم میور لکھتا ہے:

''یہ خواہش کہ مذہب اسلام کے پیغمبر ﷺ کو اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے خیال کیا جائے اور غالباً یہ کوشش کہ وہ اسماعیل کی نسل سے ثابت کیے جائیں ان کی حین حیات میں پیدا ہوئی تھی اور اس طرح محمد (ﷺ) کے ابراہیمی ''نسب نامہ'' کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے اور اسماعیل اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی سانچے میں ڈھالے گئے.''(۵)

لیکن ایک طرف تو ''سر ولیم میور'' کی یہ معاندانہ خواہش ہے' دوسری طرف ان سیکڑوں ماہرین علم الانساب' مؤرخین اور علماء کے بیانات ہیں' جنہوں نے ہر دور میں......

نبی اکرم ﷺ کے ''ابراہیمی سلسلۂ نسب'' کو ہر پہلو سے ثابت اور روایت کیا ہے' دونوں میں سے کس کا موقف کمزور ہے؟......خود اندازہ کیا جا سکتا ہے.

1۔۔۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام:

یوں تو دنیا میں بے شمار لوگ آئے' ان میں بڑے بڑے جلیل القدر انبیاء بھی تھے اور اولوالعزم مجدد اور مصلح بھی' ان میں بڑے بڑے فاتح بھی تھے اور عظیم الشان حکمران اور سالاران جیش بھی۔ ان میں بڑے بڑے نامور دھیانی گیانی بھی تھے اور نامی گرامی صوفیا اور اللہ والے بھی' لیکن تاریخ میں جو شہرت و عظمت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حصے میں آئی اور شہرت و ناموری کی جو ارفع و اعلیٰ مسند انہیں عطا ہوئی وہ کسی اور انسانی ہستی کو عطا نہیں ہو سکی...... ان کی عظمت و شہرت کا یہ عالم ہے کہ دنیا کے تین بڑے مذاہب (یہودیت' عیسائیت اور اسلام) انہی کی ذات سے اپنا ناطہ جوڑتے ہیں.

حضرت ابراہیم علیہ السلام اندازاً ۲۱۸۶ ق م سے ۲۲۰۰ ق م کے مابین عراق کے ایک قدیم شہر اُر (UR) میں ......تارح یا آذر (۶) ......کے ہاں پیدا ہوئے...... والدین نے نومود کا نام ابراہیم رکھا...... (۷) جس کے عبرانی زبان میں معنی ''موجد عظمت'' کے ہیں...... (۸) چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ واقعی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عظمت کو ایک نئے معنی پہنائے اور دنیا کے سامنے اپنی ذات کی صورت میں کردار و عمل اور عظمت و جلالت کا ایک ''کوہ بیکراں'' پیش کیا.

توریت کے مطابق حضرت ابراہیم کا نسب نامہ حسب ذیل ہے:

ابراہیم بن تارح (۲۵۰)' بن ناحور (۱۴۷)' بن سروج (۲۳۰)' بن رعو (۲۳۶)' بن نالغ (۴۳۹)' بن عامر (۴۶۴)' بن شالخ (۴۳۲)' بن ازمکشاد (۴۳۸)' بن سام (۶۰)' بن نوح علیہ السلام (۹) (بریکٹوں میں ان کی عمریں ظاہر کی گئی ہیں)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جائے پیدائش اُر (UR) کسدیوں کا شہر تھا' جو کہ

دریائے فرات کے موجودہ پاٹ سے چھ میل کے فاصلے پر اسی مقام پر واقع تھا جہاں اب ''مقیر'' نامی ٹیلہ ہے۔ آپ کی جائے پیدائش کے آثار گذشتہ صدی میں عراق کے موجودہ پائے تخت بغداد کے قریب دریافت ہوئے ہیں..... (۱۰) ڈاکٹر نفیسی کے بقول کرمان میں ایک پہاڑ کا نام بھی ابراہیم ہے...... (۱۱)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والدین (والد آذر یا تارخ...... اور والدہ محترمہ یونا [یا نوناہ] بنت کربنا بن کرثی) (۱۲) سریانی الاصل تھے...... روایات کی رو سے' جب تارخ کے ہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو ان کی عمر اس وقت ۷۵ برس تھی...... حضرت ابرہیم علیہ السلام کے دوسرے بھائیوں کے نام ''ناحوز'' اور ''حاران یا ہاران'' تھے...... حضرت لوط علیہ السلام مؤخر الذکر کے بیٹے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں (۱۳)

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب سن شعور کو پہنچے تو انہوں نے اپنے چاروں طرف لوگوں کو شرک و بت پرستی اور ہواء و ہوس میں مبتلا پایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس نظام کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے حق کی آواز بلند کی.

سلطنت کا حاکم اعلیٰ' جو نمرود کہلاتا تھا' مذہبی اعتبار سے بھی سلطنت کا ''اسقف اعظم'' (لاٹ پادری) تصور ہوتا تھا' اسی لیے شاہی ''معبد اعظم'' میں' سونے سے بنا ہوا اس کا بت بھی رکھا جاتا تھا.

اس کے علاوہ وہ خود کو قضاء وقدر کا مالک خیال کرتا تھا...... چنانچہ حق گوئی کی بنا پر حضرت ابراہیم کو بہت جلد شاہی غیض وغضب کا نشانہ بننا پڑا۔ قرآن کریم میں نمرود اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مابین ہونے والے مناظرے کا ذکر' دل چسپ پیرائے میں کیا گیا ہے...... جس سے اس ''دور'' کے حکمرانوں کی جہالت' تنگ نظری اور محدود ذہنیت پر روشنی پڑتی ہے.

اس مناظرے کی قرآنی الفاظ میں تفصیل درج ذیل ہے۔

حضرت ابراہیم: میرا پروردگار وہ ہے جو ہر شے کو زندہ کرتا اور مارتا ہے.

نمرود: میں ہی (ہوں' جو) زندہ کرتا اور مارتا ہوں (مفسرین کے مطابق اس موقع پر اس نے دو قیدیوں کو طلب کیا' ان میں ایک کو اگلے روز رہائی ملنے والی تھی' اور دوسرا پھانسی

پانے والا تھا' اس نے پھانسی پانے والے قیدی کو آزاد کر دیا اور رہائی پانے والے کو قتل کر دیا۔ اس طرح گویا اس نے عملی طور پر یہ بتا دیا کہ ''زندگی اور موت'' اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس مثال اور اس کے رویئے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ ان کا مدمقابل نہ صرف جاہل ہے' بلکہ کند ذہن بھی ہے۔ اس لیے انہوں نے اس پر بحث کرنے کی بجائے نئی دلیل پیش کرنا مناسب سمجھا۔)

حضرت ابراہیم: میرا پروردگار تو وہ ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے...... (تجھے اگر خدائی دعویٰ ہے تو) تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا.

اس پر نمرود لاجواب ہو گیا.(۱۴)

اس مناظرہ سے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذہانت' حاضر جوابی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ ترین علمی اور فکری صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے' وہاں نمرود کی کم ظرفی اور کند ذہنی کا تاثر بھی ملتا ہے.

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا' بلکہ اپنی قوم کے سامنے' ان کے بتوں کی بیچارگی اور بے کسی کو نمایاں کرنے کے لیے ان کے سالانہ جشن کے موقع پر' ان بتوں کی وہ درگت بنائی کہ تمام مشرک سیخ پا ہو گئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا...... مگر اللہ تعالیٰ نے آگ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے گل وگلزار بنا دیا جس پر ''مشرکین'' اپنا سا منہ لے کر رہ گئے.(۱۵)

2___ ہجرت (ترک وطن)

ہر نبی کی زندگی میں دعوت وتبلیغ کے بعد دوسرا مرحلہ ہجرت' یعنی اللہ کی راہ میں ترک وطن کا بھی آتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں بھی یہ مشکل اور کٹھن مرحلہ آیا۔ ان کے لیے سب سے تکلیف دہ صورت حال اس وقت پیش آئی جب ان کا اپنے والد سے تصادم ہوا۔ ان کے والد نے انہیں گھر سے نکل جانے کو کہا اور یہ دھمکی دی کہ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو وہ انہیں سنگسار کر دے گا......(۱۶) چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی حضرت سارہ رضی اللہ عنہا اور اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کے ہمراہ وہاں

سے نکل پڑے۔[۱۷]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پہلا پڑاؤ "حران" کے مقام پر ہوا۔ جہاں اس زمانے میں "کسدانیوں" کی حکومت تھی' یہ لوگ کواکب سبعہ (سات ستاروں) کی پوجا کرتے تھے۔[۱۸] قرآن کریم میں ستاروں کی بابت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جو خیالات سورۃ الانعام میں بیان کیے گئے ہیں۔ وہ غالباً اسی زمانے کے ہیں۔

اس کے علاوہ ارض جزیرہ اور شام پر بھی انہی کی حکومت تھی...... بقول حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ شام کے دارالحکومت دمشق کی تاسیس انہیں لوگوں نے کی تھی' چنانچہ دمشق کے دروازے پر ان میں سے کسی ایک ستارے کا "معبد" بھی بنا ہوا تھا۔[۱۹]

نامور مؤرخ ابن سعد نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نئے مسکن کی تلاش میں شام وفلسطین اور ارض مصر میں گئے اور ہر جگہ کئی برس تک قیام کیا، بالآخر ارض فلسطین میں قیام کا فیصلہ کر لیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جس زمانے میں "مصر" تشریف لے گئے' اس زمانے میں وہاں کا حکمران "ابی ملک" نامی شخص تھا' جو انتہائی عشرت پسند اور ایک ظالم و جابر حکمران تھا۔ اسے جب بتایا گیا کہ اس کے شہر میں ایک اجنبی جوڑا وارد ہوا ہے اور یہ کہ خاتون بہت خوب صورت ہے تو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی حضرت سارہ پر ناجائز تصرف کرنا چاہا' لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی برکت سے مصری حکمران کے جسم کو لکڑی کی طرح سخت کر دیا اور اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجۂ محترمہ کی آبرو کو بچا لیا...... بادشاہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنی "حقیقی" بیٹی "حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا" کو ان کے عقد نکاح میں دے دیا......[۲۰]

حضرت سارہ کی اس کرامت کی بنا پر بعض علما نے یہ موقف اختیار کیا ہے' کہ تین عورتوں کو اللہ تعالیٰ نے مرتبۂ نبوت سے سرفراز کیا تھا' جن میں حضرت سارہ کے علاوہ حضرت موسیٰ کی والدہ اور حضرت مریم علیھما السلام شامل ہیں......[۲۱]

بعض مؤرخین کے مطابق' یہ حکمران اس "الضحاک" نامی ایرانی حکمران کا

بھائی اور اس کی طرف سے مصر کا گورنر تھا' جس کے ظلم و جبر کی داستانیں ایرانی تاریخ کا حصہ ہیں ..... اور اس مصری حکمران کا نام' سنان بن علوان بن عبید بن عدتیج بن عملاق بن لاوذ بن سام بن نوح تھا..... (۲۲) جب کہ نامور مؤرخ اور سیرت نگار ابن ھشام نے اپنی کتاب التیجان میں اس حکمران کا نام عمرو بن امرؤ القیس بن مایلون (یا مالیون) لکھا ہے۔ (۲۳)

بہر حال اس واقعے کے بعد بادشاہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مال و دولت اور اپنی بیٹی حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے ہمراہ وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا..... غالباً اسے خدشہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وہاں کے قیام سے اس کی مملکت میں دین توحید پھیل جائے گا..... اور اس کی سلطنت زوال پذیر ہو جائے گی۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے بعد ارض مقدسہ" میں واپس آ گئے' اس وقت ان کے ہمراہ بہت سے مویشی' غلام اور مال و دولت کے علاوہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ (۲۴)

3___ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت:

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھ چکے تھے اور ان کے سر پر چاندی اتر آئی تھی تو انہیں شدت سے اولاد کی خواہش ہوئی' اس موقع پر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی:

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۲۵) اے میرے رب مجھے نیک اولاد دے۔

یہ وقت کچھ ایسی قبولیت کا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی..... اور انہیں ایک نیک اور "بردبار" لڑکے کی بشارت عطا کی' ارشاد ہے:

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ (۲۶) ہم نے اسے بردبار لڑکے کی بشارت دی۔

اس بشارت کا مصداق حضرت اسماعیل علیہ السلام بنے۔ روایات کی رو سے اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر مبارک ۸۶ برس تھی..... اسی طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام' حضرت اسحاق علیہ السلام سے' عمر میں تیرہ برس بڑے تھے۔

4۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش...... اور مکہ مکرمہ کی آباد کاری کا آغاز:

اس موقع پر اسلامی تعلیمات اور اسرائیلی روایات میں ایک بنیادی فرق نظر آتا ہے، جس میں ایک طرف حق وصدات کی جھلک پائی جاتی ہے تو دوسری طرف محض قومی حسد اور بغض کے جذبات کارفرما ہیں۔

قرآن حکیم اور احادیث طیبہ کی رو سے...... حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ کی سرزمین مکہ میں آباد کاری اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کی بنا پر تھی...... چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (۲۷)

اور جب ابراہیم علیہ السلام کو اس کے رب نے چند باتوں کے ساتھ آزمایا، تو وہ (ان پر) پورا اترے فرمایا: میں تجھے لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔

جبکہ توریت کی رو سے یہ سب کچھ محض ''سوکنون'' کے جھگڑے کا نتیجہ تھا...... لیکن کیا ابراہیم علیہ السلام جیسا پیغمبر اور اللہ تعالیٰ کا مقبول اور برگزیدہ بندہ، محض اپنی بیوی کے کہنے پر، انہی جیسے حقوق و مراعات کی حامل، اپنی دوسری بیوی اور اپنی اکلوتی اولاد کو سیکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے، ایک بے آب و گیاہ میدان میں لاوارث چھوڑ کر آ سکتا ہے؟ عقل کسی صورت بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس لیے حق بات وہی ہے جو قرآن حکیم میں ارشاد فرمائی گئی، کہ یہ سب کچھ ایک آزمائش اور امتحان کے تحت ہوا تھا...... اور پھر اللہ تعالیٰ نے اسی امتحان اور آزمائش کو دنیا کی ایک نئی صبح کا نقطۂ آغاز بنا دیا......

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کو، شیر خوارگی کے عالم میں، ان کی ''والدہ محترمہ'' کے ہمراہ اس جگہ لے کر آئے، جہاں اس وقت ''بیت اللہ شریف'' کی عمارت واقع ہے۔ انہوں نے انہیں مسجد کے بالائی حصے

میں زمزم سے اوپر والی جگہ اتار دیا۔ ان دنوں وہاں کوئی شخص موجود نہ تھا اور نہ ہی وہاں پانی تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے پاس کھجوروں کا ایک تھیلا اور پانی کا ایک مشکیزہ بھی رکھ دیا۔ پھر وہ منہ پھیر کر وہاں سے چل دیئے۔ حضرت ہاجرہؓ ان کے پیچھے پیچھے آئیں اور پوچھا اے ابراہیم علیہ السلام آپ ہمیں ایک ایسی جگہ کیوں چھوڑ کر جا رہے ہیں جہاں نہ تو کوئی انسان ہے اور نہ ہی کوئی دوسری شے؟ انہوں نے یہ بات کئی مرتبہ دہرائی' مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کوئی جواب نہ دیا' پھر جب انہوں نے کہا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا حکم دیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ اس پر خاتون جنت حضرت ہاجرہؓ نے کہا: تب وہ ہمیں یہاں ہلاک نہ ہونے دے گا۔''

اس طرح ''بیت اللہ شریف'' کی تعمیر سے قبل اس کی آبادکاری کا اہتمام کیا گیا' مقصد یہ تھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تمام تربیت اور پرورش اسی ''ماحول'' اور اسی علاقے میں ہو' تاکہ وہ اس علاقے سے مکمل طور پر مانوس ہو جائیں...... اس علاقے کے پہاڑ انہیں اپنا دوست محسوس کریں اور اس علاقے کی وادیوں میں انہیں اپنائیت کی جھلک نظر آئے۔

5___ کعبۂ معلیٰ کی تعمیر:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عظیم اور تاریخی کارناموں میں سے سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اسی بے آب و گیاہ میدان میں اپنے لخت جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ہمراہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی مشیت کے تحت اس پاکیزہ اور مقدس گھر کی تعمیر فرمائی جسے دنیا میں اللہ تعالیٰ کے سب سے قدیم.... اور سب سے زیادہ متبرک و محترم گھر ہونے کا شرف حاصل ہے اور پھر اس کا پہلا حج کر کے دنیا میں اس کا اعلان بھی فرمایا اور ذاتی فعل اور عمل کے ذریعے خانۂ خدا کے حج اور اس کی زیارت کا منہج و طریقہ قائم کیا۔ (۲۹)

(بیت اللہ شریف کی تعمیر اور اس سے متعلقہ امور کا ذکر آئندہ اوراق میں آئے گا)

اس کے علاوہ انہوں نے دنیا کو حقیقی توحید کا درس دیا' اور پھر ایک طویل اور کامیاب زندگی گزار کر...... دو سو (۲۰۰) برس کی عمر میں راہی ملک بقا ہوئے۔ (۳۰)

6 ___ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد مبارکہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات اور ان کی اولاد میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت عطا کی تھی' قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ؕ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ (۳۱)

اور ہم نے اسے اور اسحٰق علیہ السلام کو برکت دی اور ان دونوں کی نسل میں کوئی تو نیکوکار اور کوئی اپنی جان پر کھلا ظلم کرنے والا ہے۔

اسی طرح تورات میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں برکت دیئے جانے کا ذکر ہے' چنانچہ تکوین میں ہے:

''اور خداوند کے فرشتے نے اس سے کہا میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا' یہاں تک کہ کثرت کے باعث اس کا شمار نہ ہو سکے گا''۔ (۳۲)

اس کا مزید اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کے ہر بیٹے سے اللہ تعالیٰ نے کئی کئی قبیلے اور کئی کئی اقوام پیدا کیں۔ (۳۳) اور آج دنیا میں انہی کی ''اولاد'' دنیا کے ایک بڑے علاقے پر پھیلی ہوئی ہے۔

قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا تذکرہ ہے' یعنی (۱) حضرت ہاجرہؑ سے حضرت اسماعیل پیدا ہوئے' اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر مبارک ۸۶ برس تھی' جبکہ حضرت سارہؓ سے حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت ہوئی' (۳۴) اس وقت حضرت ابراہیم کا سن مبارک ۹۹ برس تھا۔ اس طرح حضرت اسماعیل حضرت اسحاق علیہ السلام سے تیرہ برس بڑے تھے۔

اسرائیلی اور یہودی آثار میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کئی اور بیٹوں کا بھی تذکرہ ہے۔ توریت میں ہے کہ حضرت ابراہیم نے حضرت سارہ کے بعد (قطورہ) بن یقطن الکنعانیہ سے شادی کی' جس سے حضرت ابراہیم کے ہاں حسب ذیل بیٹے

پیدا ہوئے:

(۳) زمران

(۴) یقسان

(۵) مدان

(۶) مدیانی

(۷) اسباق

(۸) رسوخ (۳۴)

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ ابوالقاسم السہیلی "کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پھر حجون بنت زمین کے ساتھ نکاح کیا اور ان سے حسب ذیل پانچ بیٹے ہوئے:

(۹) کیسان

(۱۰) سورح

(۱۱) امیم

(۱۲) لوطان

(۱۳) نافس

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں کل تیرہ بیٹے پیدا ہوئے۔ (۳۵)

حضرت ہاجرہ......ام اسماعیل رضی اللہ عنہا

عظیم مردوں کے اس خاندان میں تاریخ ایک عظیم المرتبت خاتون کا بھی تذکرہ کرتی ہے جن کی صداقت' پامردی اور مستقل مزاجی' تاریخ اسلام ہی کا نہیں' بلکہ تاریخ عالم کا اہم ترین موضوع ہے۔ اس عظیم اور گراں مرتبت خاتون محترم کا اسم گرامی ''ہاجر'' ہے'(۳۶) جو ''اسلامی ادب'' میں ہاجرہ بن گیا۔

ہاجرہ اصل میں عبرانی لفظ ہاغاز کی معرب شکل ہے۔ جس کے معنی بیگانہ اور اجنبی کے ہیں' اصل میں ان کا وطن مصر تھا' اس بنا پر انہیں ہاجرہ یعنی اجنبی کہا گیا۔(۳۷)

حضرت ہاجرہ کی ''ذات'' بھی تاریخ کی ان برگزیدہ شخصیات میں سے ایک ہیں' جن کے متعلق اسرائیلی اور یہودی ''آثار'' باہم مختلف ہیں ..... اسلامی آثار کی رو سے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا بادشاہ مصر کی بیٹی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی تھیں جبکہ اسرائیلی روایات کی رو سے ان کی خادمہ تھیں...... حضرت ہاجرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں کیسے پہنچیں؟ ...... اس کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے۔

مختصراً یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام' جب فلسطین کی سرزمین میں خشک سالی کے باعث' مصر پہنچے اور وہاں بادشاہ مصر نے حضرت سارہؓ کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی برکت سے وہ اس کے شر سے محفوظ رہیں' تو بادشاہ نے اپنی بیٹی حضرت ہاجرہؓ' ان کے عقد میں دے دی اور فرمایا: کہ یہ تمہاری خدمت کرے گی' اس موقع کے لیے حدیث نبوی کے الفاظ یہ ہیں:

فدعا بعض حجبه فقال	پھر اس نے اپنے کسی دربان کو بلایا اور کہا تم میرے پاس
انکم لم تاتونی بالانسان	کسی انسان کو نہیں' بلکہ کسی شیطان کو لائے ہو' پھر اس
انما اتیتمونی بشیطان	نے ان (حضرت سارہؓ) کی خدمت کے لیے "ہاجرہ" کو
فاخدمها هاجر فاتته وهو	دیا پھر وہ (سارہؓ) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں'
قائم یصلی فاوما بیده مهیم	اس وقت وہ کھڑے ہوئے ابھی نماز پڑھ رہے تھے۔
قالت رد الله کید الکافر او	انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کیا ہوا؟
الفاجر فی نحره واخدم	(حضرت سارہ نے کہا' اللہ تعالیٰ نے کافر (یا فرمایا)
هاجر قال ابو هریره تلک	فاجر کے شر کو اس کی گردن میں لوٹا دیا اور اس نے بطور
امکم یا بنی ماء	خادمہ ہاجر کو دیا ہے' پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا:
السماء... (۳۸)	اے آسمانی پانی کے بیٹو! یہی تمہاری ماں ہیں۔

جبکہ مسلم کی روایت میں ہاجر کے بجائے "آجر" کے الفاظ ہیں۔...... (۳۹)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے بقول ہاجر ہو' یا آجر' بہر صورت یہ ایک سریانی الاصل لفظ ہے۔ (۴۰)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت ہاجرہ کا والد قبائل کا بادشاہ تھا اور وہ حفن' نامی ایک مصری قصبے کی رہنے والی تھیں'...... یہ قصبہ بہت سے قدیم آثار پر مشتمل تھا۔ (۴۱)

بعض تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کا مصری حکمران حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہم وطن تھا اور اس رشتے کے ذریعے اس قدیم تعلق کا احیاء مقصود تھا' چنانچہ توریت کا شارح' ابوشلوم تکوین' ۱۶/۱ کی شرح میں لکھتا ہے:

"ہاجرہ فرعون مصر کی بیٹی تھیں' فرعون نے جب حضرت سارہ کی کرامات دیکھیں تو کہا:

تیرا اس کے گھر میں لونڈی بن کر رہنا دوسرے کے گھر میں بی بی بن کر رہنے سے بہتر ہے"۔ (۴۲)

نامور محقق' علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''بنی اسرائیل کہتے ہیں کہ ہاجرہ سارہ کی لونڈی تھیں۔ اس لیے بنی اسماعیل بنی اسرائیل کے برابر نہیں۔ اولاً تو یہ اصول بذات خود غلط ہے، ثانیاً حضرت ہاجرہ کا لونڈی ہونا زیر بحث ہے۔ ناظرین کو اس وقت عرب سامیہ اولیٰ کی تاریخ کا پھر اعادہ کرنا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اس وقت مصر میں حکمران قوت عرب کی ایک سامی قوم تھی' جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نہایت قریبی نسبی تعلقات تھے' لفظ ہاجرہ کا عبرانی ہونا بھی اس دعوے کی ایک مستحکم دلیل ہے، سفر ایشار میں، جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے، مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہم وطن تھا''...... (۴۳)

حضرت ہاجرہ ؓ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں جس ایثار و خلوص اور عزم و ہمت کا مظاہرہ کیا اور جس طرح انہوں نے اپنے لخت جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تربیت فرمائی' اس سے بھی ان کے عظیم پس منظر پر روشنی پڑتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ وہ واقعی کسی بڑے خاندان کے چشم و چراغ تھیں.

نبی اکرم ﷺ کو بھی اس رشتے کے تقدس کا بڑا خیال تھا' اسی لیے آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تاکید فرمائی تھی کہ جب تم مصر کا علاقہ فتح کرو' تو وہاں کے باشندوں سے نرمی اور تلطف سے پیش آنا' اس لیے کہ ان سے تمہاری قرابت داری ہے. (۴۴)

حضرت ہاجرہ ؓ کے دوسرے حالات زندگی:

حضرت ہاجرہ کے دوسرے حالات زندگی معلوم نہیں ہیں۔ یہودیوں نے ان کا تذکرہ دانستہ طور پر نظر انداز کیا ہے اور مسلم آثار میں بھی ان کے حالات زندگی کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا.

تورات سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ہاجرہ ؓ سے ان کی اولاد میں برکت کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ تکوین میں ہے:

''ہاجرہ اپنی بی بی کے گھر واپس جا' میں تیری نسل کو اتنا بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے گی.

تو حاملہ ہے تو ایک بیٹا جنے گی' تو اس کا نام اسماعیل رکھنا' کہ خدا نے تیرا دکھ سنا''۔(۴۵)

تاہم یہ بات یقینی ہے کہ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کے وقت تک حیات تھیں، لیکن جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بعد میں دو مرتبہ حضرت اسماعیل سے ملنے آئے اور انہیں پہلی بار اپنی چوکھٹ بدلنے کا دوسری مرتبہ اسے برقرار رکھنے کا مشورہ دیا اس وقت ان کا وصال ہو گیا تھا.

روایات کی رو سے آپؑ کا مدفن ''بیت اللہ شریف'' کے میزاب رحمت (پرنالے) کے عین نیچے ''مطاف'' کے اندر ہے. واللہ اعلم

حوالہ جات وحواشی

(۱) الحج (۷۸/۲۲).

(۲) البقرہ (۱۲۹/۲).

(۳) ابن سعد: الطبقات' ۱:۱۳۱.

(۴) ولی الدین خطیب' مشکوٰۃ المصابیح.

(۵) Life of Mahammad بحوالہ شبلی نعمانی' سیرت النبی' ۱۶۱/۱ (ج ۱).

(۶) قرآن کریم میں صراحت ہے کہ حضرت ابراہیم کے والد محترم کا نام آذر تھا' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ آزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً (الانعام' ۷۴/۶) اور جب ابراہیم نے اپنے باپ آذر سے کہا' کہ کیا تو بتوں کو اپنا معبود بناتا ہے.

مگر چونکہ توریت میں حضرت ابراہیم کے والد کا نام ''تارخ'' مذکور ہے' (جو عرب مصنفین کے ہاں ''تارح'' ہو گیا)' اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کے نام میں اختلاف پیدا ہو گیا' کہ ان کا اصل نام کیا تھا؟ بعض مفسرین اور مؤرخین نے کہا کہ ''حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد تارخ ہی تھے اور آزر چچا یا تایا تھا اور چونکہ چچا یا تایا کو بھی' مجازاً باپ کہہ دیا جاتا ہے، اس لیے قرآن مجید نے اس کے لیے ''باپ'' (ابیہ) کا لفظ استعمال کیا (علامہ جلال الدین السیوطی نے اپنی کتب میں اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بھی اپنی تفسیر' اور رسالے تقدیس والدی المصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں یہی موقف اپنایا ہے)' لیکن یہ موقف اس لیے درست نہیں ہے کہ قرآن حکیم کے ایک دوسرے مقام (التوبہ......۱۱۴/۱) میں' حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے والد سے ان کے کافر اور دشمن خدا ہونے کی بنا پر

اظہار براءت کا ذکر ہے اور اگر ''آذر'' کے لیے ''ابیہ'' (باپ) کا استعمال مجازی ہوتا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد کوئی اور ہوتا تو اس نفی کا کوئی جواز نہیں رہتا' اس لیے جمہور مفسرین اور مؤرخین نے یہی موقف اختیار کیا ہے کہ آذر اور تارخ (یا تارح) ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔''

(۷) ابراہیم عربی صورت ہے' عبرانی اور سریانی زبانوں میں اس کا تلفظ ابراہام اور براھم وغیرہ کی صورت میں ملتا ہے۔

(۸) ڈاکٹر نفیسی: 'فرہنگ نفیسی' بذیل مادہ۔

(۹) ابن کثیر 'البدایہ' ۱/۱۳۹..... بریکٹوں میں ان بزرگوں کی توریت میں مذکور، عمر دی گئی ہے' اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان فاصلہ اس سے کہیں زیادہ ہے' اصل میں پرانے زمانے میں یہ رواج تھا کہ نسب نامہ بیان کرتے وقت معروف لوگوں کا ذکر کیا جاتا تھا اور غیر معروف لوگوں کا ذکر چھوڑ دیا جاتا تھا' اس اعتبار سے یہ ''نسب نامہ'' نامکمل ہے اور صرف مشہور و معروف لوگوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔

(۱۰) کتاب الہدیٰ' ص ۳۰۴۔

(۱۱) فرہنگ' بذیل مادہ۔

(۱۲) ابن کثیر' البدایہ (۱/۱۴۰)۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس لفظ کی اصلی صورت کیا تھی:...... قرآن کریم میں' حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ میں ''حضرت ابراہیم کے والد اور ان کے کفر کا تذکرہ اس قیاس کی اجازت دیتا ہے کہ ان کی والدہ محترمہ یونا یا نوناہ ضرور ایمان لے آئی تھیں' اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مغفرت کی دعا تو دونوں کے لیے کی تھی (دیکھیے سورۂ ابراہیم' ۱۴/۴۱)' مگر دعا کی ممانعت فقط والد کے لیے ہوئی ہے... (التوبہ' ۹/۱۱۴)' جو اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت نوناہ رضی اللہ عنہا حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لے آئی تھیں۔

علاوہ ازیں حضرت ابراہیم کے والد کو قبول اسلام میں جن سیاسی اور معاشرتی مجبوریاں کا لحاظ تھا' آپ کی والدہ ماجدہ ان سے بے نیاز تھیں' اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان والے لوگوں میں آپ کی والدہ کا پیش قدمی کرنا قیاس کے مطابق ہے (واللہ اعلم)۔

(۱۳) البدایہ' (۱/۱۴۰)۔

(۱۴) البقرہ (۲/۲۵۸).

(۱۵) الانبیآء (۱۷: ۶۸: ۶۹).

(۱۶) مریم...... (۱۹/۴۶).

(۱۷) العنکبوت...... (۲۹/۴۶)۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ قرآن کریم نے صراحت کی ہے کہ اس سفر ہجرت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان میں سے ان کی بیوی اور ان کے بھتیجے کے علاوہ کوئی شخص ان کے ہمراہ نہ تھا' مگر بعض مسلم مؤرخین نے بعض اسرائیلی روایات کے زیر اثر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ سفر ہجرت پورے خاندان کے ہمراہ تھا۔ چنانچہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ جب یہ قافلہ ''حران'' کے علاقے میں پہنچا' تو وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد تارخ انتقال کر گئے...... (۱/۱۵۰) ...... جب کہ ایک اور مقام پر انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی ناحور' ان کی بیوی ''ملک'' کو بھی ہجرت کرنے والے لوگوں میں شامل کیا ہے...... (۱/۱۵۰)۔ ان کا یہ بیان توریت کے مطابق ہے' لیکن قرآنی نصوص سے متصادم ہے' اس لیے کہ ''قرآن حکیم'' کی رو سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ترک وطن کا فیصلہ محض اس لیے کیا تھا کہ ان کے والد نے انہیں سنگسار کرنے کی دھمکی دی تھی' اس صورت میں والد اور چچا وغیرہ کی سفر ہجرت میں رفاقت کا کوئی جواز نہیں رہتا۔

اسی مقام (البدایۃ ۱/۱۵۰) پر علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے گھر سے چلنے لگے' تو حضرت سارہ رضی اللہ عنہا بھی جو ان کی چچا زاد تھیں، ان کے ہمراہ ہو لیں اور یہ کہ انہوں نے حران کے مقام پر باہم نکاح کیا...... ہمارے خیال میں یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بہتان طرازی ہے اور تورات لکھنے والوں کی رومان پسندی کا نتیجہ ہے' حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم تو اللہ کے عظیم رسول اور نبی تھے۔ یہ بات تو ایک عام انسان کے درجے سے بھی کم تر ہے۔

(۱۸) (دیکھیے الانعام' ۶/۷۶-۷۹).

(۱۹) ابن کثیر' البدایۃ (۱/۱۴۰).

(۲۰) البخاری' (۶/۳۸۸' کتاب بدؤ الخلق' باب ۸' حدیث ۳۳۵۸).

(۲۱) حافظ ابن کثیرؒ البدایہ، مگر آگے خود ہی اس کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ جمہور کا مسلک یہ ہے کہ تینوں عورتیں "ولیہ" تھیں، نبی نہ تھیں، اس لیے کہ قرآن کریم میں صرف مردوں کو نبوت دیئے جانے کا تذکرہ ہے (یوسف ۱۲/۱۰۹).

(۲۲) ابن کثیرؒ (۱/۱۵۲)، مگر یہ روایت مگر اسرائیلیات میں سے ہے.

(۲۳) ایضاً.

(۲۴) ابن کثیرؒ (۱/۱۵۲).

(۲۵) الصافات (۳۷/۱۰۰).

(۲۶) ایضاً (۳۷/۱۰۱).

(۲۷) البقرہ (۲/۱۲۴).

(۲۸) البخاری۔ (۶/۳۹۶) (کتاب الانبیاء باب ۹، یزفون...... حدیث ۳۳۶۴).
اس واقعے کی تفصیل آئندہ اوراق میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے تذکرہ میں بیان کی جائے گی.

(۲۹) الحج (۲۲/۲۶-۲۷).

(۳۰) البدایہؒ (۱/۱۵۵).

(۳۱) الصافات (۳۷/۱۱۳).

(۳۲) تکوین (۱۶/۱۰).

(۳۳) الصافات (۳۷/۱۱۳).

(۳۴) توریت، تکوین، (۲۵/۱-۵: نیز دیکھئے ابن کثیرؒ (۱/۱۷۵) بحوالہ القاسم السھیلی، التعریف والاعلام.

(۳۵) ایضاً.

(۳۶) ہاجر اصل میں سریانی لفظ "آجر" سے معرب ہے، جس کی معنی ہیں "اجنبی" اور بیگانہ کے ہیں (فتح الباری، ۶/۳۸۸)

(۳۷) مولانا سید سلیمان ندوی، ارض القرآن، دارالاشاعت کراچی، ص ۸۰.

(۳۸) البخاری، (۶/۳۸۸)، کتاب الانبیا، باب ۸، حدیث ۳۳۵۸)۔ توریت میں یہ کہانی

بالکل مختلف ہے' اس میں ہاجرہ کو محض ایک مصری لونڈی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر تکوین کے سولھویں باب میں ہے: ''اور ابرام کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی' اس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا' اور ساری نے ابرام سے کہا کہ دیکھ خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے' سو تو میری لونڈی کے پاس جا' شاید اس سے میرا گھر آباد ہو (تکوین ۶/۲)۔

(۳۹) فتح الباری' (۳۹۴/۶)' تاہم صحیح مسلم (مطبوعۃ مکتبۃ الاسلامیہ' ترکی' ۱۸۴۱/۴) میں ''آجر'' کے بجائے ھاجر کے الفاظ ہیں۔ تاہم صحیح مسلم کے حاشیے میں ویقال کے ساتھ ''آجر'' کے الفاظ میں نقل کیے گئے ہیں۔

(۴۰) فتح الباری' (۳۹۴/۶)۔

(۴۱) ایضاً۔

(۴۲) کتاب الہدیٰ' (ص ۴۷۷)۔

(۴۳) ارض القرآن' (ص ۲۸۰)۔

(۴۴) احمد بن حنبل' مسند۔

(۴۵) تکوین' ۱۰/۱۶۔

باب 3

گلشن ابراہیمی کے گل سر سبد: حضرت اسماعیل علیہ السلام

یوں تو حضرت ابراہیم کے ہاں تیرہ اولادیں ہوئیں اور پھر ہر ایک سے یقینی طور پر نسل انسانی کا وسیع سلسلہ فروغ پذیر ہوا' لیکن اللہ تعالیٰ نے جو برکت حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد کو عطا کی وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے صاجزادوں کی اولاد کو نصیب نہیں ہوئی...... پھر ان دو بزرگوں سے بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کو جس طرح بڑھا کر ''دنیائے عرب'' کے کونے کونے میں بالخصوص اور باقی دنیا میں بالعموم پھیلایا' اس کی مثال تاریخ انسانی میں کہیں اور نہیں ملتی.

اس برکت اور قبولیت کا سبب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو' جنہیں بڑھاپے میں' اولاد کی نعمت عطا ہوئی تھی اور وہ انہیں بے حد عزیز تھی' اپنی اکلوتی اولاد کو راہِ خداوندی میں قربان کرنے کا حکم دیا گیا، جو کہ ان کے لیے ایک کڑا امتحان تھا. لیکن جب دونوں باپ بیٹے اس امتحان میں کامیاب ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کی اولاد میں برکت دینے کا وعدہ فرمایا؛ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰى اِسْحٰقَ...... (1) اور ہم نے اس پر (اسماعیل) اور اسحاق پر برکتیں نازل کیں۔

جبکہ توریت میں ہے:

اور اسماعیل علیہ السلام کے حق میں بھی' میں نے تیری دعا سنی' دیکھو میں اسے برکت

دوں گا اور اسے آبرومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا...... (۲)

ایک اور مقام پر ہے کہ فرشتے نے حضرت ہاجرہ سے کہا:

''میں تیری اولاد کو بہت بڑھا دوں گا' یہاں تک کہ کثرت کے سبب اس کا شمار نہ ہو سکے گا...... (۳)

1۔ اسماعیل علیہ السلام کی وجہ تسمیہ:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت ایک طویل انتظار اور دعاؤں کے بعد ہوئی تھی' اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کا نام اسماعیل رکھا' جو سمع (سن لیا) اور ایل (اللہ) سے مرکب ہے' جس کا مطلب ہے'' اللہ نے ان کی دعا اور زاری سن لی'' یہ عبرانی الاصل لفظ ہے۔ اصل میں نشماع ایل ہے۔ شماع (سماع) سننا اور ایل کے معنی ہیں اللہ (اللہ نے سن لیا)۔ خود توریت میں ان کے نام کی وجہ تسمیہ اور حکمت یہ بیان کی گئی ہے:

اس لیے کہ خداوند نے تیرا دکھ سن لیا۔ (۴)

''قرآن کریم میں بھی اس دعاء و مناجات کا تذکرہ ہے' مثال کے طور پر ایک مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا تذکرہ کرتے ہوئے' ارشاد ہے:

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ...... (۵) پروردگار مجھے نیک اولاد دے' سو ہم نے اسے بردبار لڑکے کی بشارت دی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور انہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام جیسا نیک اور صاحب علم فرزند عطا فرمایا۔ تیرہ برس کے سن میں باپ نے اپنے بیٹے کا ختنہ کر دیا' اسی سال اسحاق پیدا ہوئے' آٹھویں دن ان کا ختنہ ہوا۔

2۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام و ام اسماعیل علیہ السلام کی ہجرت:

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہر طرح سے آزمائش کرتا ہے' چنانچہ پہلے ابراہیم علیہ السلام

کی ۸۶ برس تک اولاد نہ دے کر آزمائش کی گئی اور پھر اس اکلوتی اولاد کو خود سے دور کرنے کا حکم دے کر ان کو مزید امتحان میں ڈالا گیا' مگر سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہر مرحلے میں سرخرو ہوئے اور تمام آزمائشوں پر پورا اترے۔

تورات کی رو سے' حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ہجرت کا واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر ۱۵-۱۶ برس تھی' جبکہ اسلامی روایات کی رو سے وہ ابھی شیر خوار تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں صحرائے حجاز میں پہنچانے کا حکم ملا' ''حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس حکم کی تعمیل کی...... ایک حدیث نبوی میں اس واقعے کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے' فرمایا:

> ''سب سے پہلی خاتون' جس نے اپنے اگلی طرف سے کمر پر پٹکا باندھا وہ ام اسماعیل ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو...... جبکہ وہ ابھی شیر خوار تھے' لے کر چلے اور انہیں بیت اللہ کے پاس ایک پیڑ کے نیچے' زمزم کی بالائی جانب اتار دیا۔ ان دنوں مکہ مکرمہ میں کوئی شخص نہ تھا اور نہ ہی پانی موجود تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں وہاں اتارا اور ان کے قریب کھجوروں کا تھیلا اور پانی کا ایک مشکیزہ رکھ دیا' پھر (حضرت) ابراہیم علیہ السلام واپس چل دیئے' ام اسماعیل علیہ السلام یہ پوچھنے کے لیے ان کے پیچھے پیچھے آئیں ...... کہ آپ ہمیں یہاں' ایک ایسے میدان میں' جہاں نہ تو کوئی انسان ہے اور نہ ہی کوئی دوسری شے' چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟ انہوں نے یہ بات کئی مرتبہ پوچھی' مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ انہوں نے کہا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے؟ اس پر انہوں نے کہا: ہاں (حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے) نے کہا: پھر وہ ہمیں ہلاک نہ ہونے دے

گا۔ بعد ازاں وہ واپس لوٹ آئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بدستور چلتے رہے' یہاں تک کہ گھاٹی کے پاس اس جگہ جا پہنچے جہاں سے وہ انہیں نہ دیکھ سکتے تھے تو انہوں نے بیت اللہ شریف کی طرف منہ کیا اور پھر اپنے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی: ''پروردگار' میں نے اپنی اولاد کو ایک بے آب و گیاہ میدان میں آباد کیا ہے...... پروردگار' تاکہ وہ نماز قائم کریں' سو تو لوگوں کے دلوں کو ان کی جانب مائل کر دے اور انہیں پھل عطا کر' تاکہ وہ شکر ادا کریں۔

''حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ اپنے نور چشم کو دودھ پلاتیں اور خود پانی پیتی رہیں' یہاں تک کہ مشکیزے میں پانی ختم ہو گیا۔ اب انہیں پیاس لگی اور ان کا بیٹا بھی پیاسا ہو گیا۔ وہ آنکھیں موڑ موڑ کر (یا فرمایا) پریشانی کے ساتھ دیکھنے لگیں...... اور جب ان سے (اپنے بچے کی پیاس کا) منظر نہ دیکھا گیا تو وہ وہاں سے چل دیں۔ انہوں نے کوہ ''صفا'' کو اپنے سے متصل اور قریب ترین پہاڑ پایا' تو وہ اس پر جا کر کھڑی ہو گئیں' پھر انہوں نے آس پاس کے میدان کو خوب نظریں دوڑا کر دیکھا' شاید کوئی شخص نظر آ جائے' مگر کوئی شخص دکھائی نہ دیا۔ اس پر وہ کوہ صفا سے نیچے اتر آئیں۔ جب وہ میدان (وادی) میں پہنچیں تو انہوں نے اپنی اوڑھنی کا پلو اٹھایا اور پھر وہ اس طرح بھاگیں جیسے کوئی تیز دوڑنے والا شخص بھاگتا ہے تا آنکہ وہ میدان عبور کر گئیں اور ''مروہ'' پر جا چڑھیں' پھر کھڑے ہو کر آس پاس دیکھا کہ شاید کوئی شخص نظر آ جائے' مگر کوئی شخص نظر نہ آیا۔ انہوں نے یہ عمل سات مرتبہ دہرایا' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہی واقعہ

ان دونوں پہاڑوں کے مابین لوگوں کی ''سعی'' کی بنیاد ہے' پھر جب وہ (ساتویں مرتبہ) مروہ پر چڑھیں' تو انہوں نے ایک آواز سنی' وہ بولیں' ''صہ'' جس کا مطلب ان کی اپنی ذات سے تھا' پھر انہوں نے دوبارہ یہ آواز سنی' انہوں نے کہا: (اے شخص) اگر تیرے پاس کوئی مدد ہو؟ (تو ہماری مدد کر)' انہوں نے دیکھا کہ زمزم (کنوئیں) کے پاس ایک فرشتہ ہے' جس نے اپنے عقب سے (یا فرمایا)' اپنے پروں سے زمین کو کھودا' یہاں تک کہ پانی نکل آیا' اس پر وہ اس کی ''حد بندی'' کرنے لگ گئیں اور اس کے پانی سے چلو بھر بھر کر اپنے مشکیزے میں ڈالنے لگیں جو اس وقت جوش مار رہا تھا''.

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ام اسماعیل علیہ السلام پر رحم کرے' اگر وہ زمزم کو یونہی رہنے دیتیں' یا فرمایا' اگر وہ پانی سے چلو نہ بھرتیں تو زمزم ایک بہنے والا چشمہ بن جاتا۔ حضرت ام اسماعیلؑ نے پانی پیا اور اپنے بچے کو دودھ پلایا۔ اس پر فرشتے نے کہا: تم یہاں اندیشہ نہ کرنا' اس لیے کہ یہاں اللہ کا گھر ہے' جسے یہ لڑکا اور اس کا باپ دونوں مل کر بنائیں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے گھر والوں کو ہلاک نہیں کرتا'' (۶)

تورات کا بیان اس سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ (۷) دونوں کے مابین موازنے سے سچ اور جھوٹ میں فرق خود واضح ہو جاتا ہے.

3 ___ مکہ مکرمہ کی آباد کاری:

حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ دونوں نے اس ''شہر جاناں'' میں کچھ اس طرح بسیرا کیا' کہ جلد ہی ان دونوں کی بدولت جنگل میں منگل کا سامان پیدا ہو گیا' اور اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی برکت سے' اپنے گھر کو' اچھے لوگوں کی' ہمسائیگی

سے آباد فرما دیا' نبی اکرم ﷺ نے اس واقعے کی خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"یہ لوگ اسی طرح یہاں آباد رہے' تا آنکہ یہاں "جرہم" کے ایک قافلے (یا فرمایا) جرہم کے ایک خاندان کا یہاں سے گزر ہوا' جو کداء کے راستے سے اس طرف آ رہا تھا۔ یہ لوگ زیرین مکہ میں اترے' یہاں انہوں نے ایک کوا اڑتے ہوئے دیکھا' تو وہ بولے: یہ پرندہ ضرور پانی کے کسی چشمے کا چکر لگا رہا ہے' حالانکہ ہم چند روز پہلے اس وادی سے گزرے تھے تو یہاں پانی کا کوئی وجود نہ تھا۔ پھر انہوں نے ایک یا دو افراد کو پانی کا پتہ لگانے کے لیے بھیجا' تو انہوں نے واپس آ کر خبر دی کہ ہاں یہاں پانی موجود ہے' پھر جب وہ لوگ وہاں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ موجود ہیں' انہوں نے کہا: کیا آپ ہمیں اس بات کی اجازت دیں گی کہ ہم لوگ آپ کے پاس پڑاؤ کر لیں وہ بولیں ہاں، لیکن چشمے پر تمہارا کوئی حق نہ ہوگا' انہوں نے کہا' ٹھیک ہے۔"(۸)

بنو "جرھم" جو کہ قحطانی النسل سلسلے کے لوگ تھے۔ بنو اسماعیل کے اچھے ہمسایے ثابت ہوئے' اس کے علاوہ اس قبیلے سے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے عربی زبان سیکھی اور اس طرح عبرانی نسل سے عربی نسل کی پیدائش کا سلسلہ شروع ہو گیا' جس کے نتیجے میں عربوں کی ایک نسل (عرب مستعربہ) وجود میں آئی' جو قدیم نسلوں سے زیادہ پر جوش' جواں ہمت' الوالعزم اور اعلیٰ ترین انسانی اور اخلاقی اقدار و روایات کی حامل تھی۔

4 واقعہ قربانی:

اس کے بعد وہ واقعہ پیش آیا' جس نے دنیا کی تاریخ میں جذبۂ للھیت' قربانی اور اخلاص و فدائیت کی ایک نئی اور پرشکوہ داستان رقم کی ہے' ہماری مراد حضرت

ابراہیم علیہ السلام کی اپنے اکلوتے لخت جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی سے ہے' جو اسی جگہ پیش کی گئی اور بارگاہ خداوندی میں قبول ہوئی.

قربانی کے اس واقعے کا قرآن حکیم میں اجمالاً! تذکرہ کیا گیا ہے' چنانچہ ارشاد ہے:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ○ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ○ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ○ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (۹)

سو جب وہ لڑکا ان کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو انہوں نے کہا: بیٹا میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں' سو تم بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے' وہ بولے ابا جان آپ کر ڈالیے' جس کا آپ کو حکم ملا ہے' اگر اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے' پھر جب دونوں نے حکم کو تسلیم کیا اور (باپ نے بیٹے کو کروٹ کے بل) لٹا دیا' تو ہم نے انہیں پکارا' اے ابراہیم علیہ السلام تو نے اپنا خواب سچا کر دکھایا' ہم (اپنے) مخلص بندوں کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں' بے شک یہ ایک کھلا امتحان تھا اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے بدلے میں دیا.

ان آیات مبارکہ میں اگرچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا نام مذکور نہیں ہے' لیکن آیات کے سیاق وسباق اور تفسیری روایات سے' یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کا مصداق حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی تھے' حضرت اسحاق کی اس وقت تک پیدائش ہی نہ ہوئی تھی ۔ ان کی پیدائش کی بشارت اس کے بعد والی آیات (۱۰) میں دی گئی ہے...... اور آیات پر غور کرنے سے یہی واضح ہوتا ہے کہ یہ بشارت اسی قربانی اور اسی اخلاص کے نتیجے کے طور پر دی گئی.

4____ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے یا حضرت اسحاق علیہ السلام:

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی مناسب ہوگا' کہ مختلف وجوہ کے تحت بائبل میں

جو تحریفات ہوئیں' ان کے ذریعے یہودیوں نے ایسی تمام باتوں کو یا بدل دیا' یا مسخ کر ڈالا' جو ان کے خاندان بنو اسماعیل کے فضل و شرف پر دلالت کرتی تھیں' جن میں ذبح کا واقعہ بھی شامل ہے' جسے انہوں نے نہایت دیدہ دلیری سے حضرت اسحاق علیہ السلام سے منسوب کر ڈالا ہے (۱۱) مگر خود توریت سے ہی اس غلط انتساب کی تردید ہوتی ہے.

اس سلسلے میں چند بنیادی امور کی طرف اشارات مفید ہوں گے' تفصیل ذیل ہے.

(1) پہلوٹھا کون ہے؟

سابقہ شریعتوں میں صرف اسی انسان یا جانور کی قربانی قبول کی جاتی تھی' جو پہلوٹھا ہوتا' اس لیے کہ توریت میں ہے:

''اس لیے کہ بنی اسرائیل میں سے سب پہلوٹھے' کیا انسان کیا حیوان میرے ہیں اور میں نے جس دن ملک مصر کے پہلوٹھوں کو مارا' اسی دن اپنے لیے مقدس کیا''. (۱۲)

اور روایات کے مطابق ہابیل نے جن مینڈھوں کی قربانی کی تھی وہ بھی پہلوٹھے بچے تھے. (۱۳)

یہودی شریعت میں پہلوٹھا بیٹا' خواہ وہ غیر پسندیدہ بیوی سے ہوتا' تب بھی بعد کی اولاد پر فضیلت اور فوقیت رکھتا تھا. (۱۴)

دوسری طرف اس میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلوٹھی اولاد حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں، نہ کہ حضرت اسحاق' اب یا تو توریت کے مختلف صحیفوں میں بکھری اور پھیلی ہوئی یہ تمام تصریحات غلط ہیں یا پھر ان کا بنایا ہوا افسانہ درست نہیں ہے؟

(2) وحی کے الفاظ:

پھر ابراہیم علیہ السلام پر جو وحی آئی' اس میں صراحت تھی کہ وہ بیٹا قربانی کیا جائے' جو اکلوتا اور محبوب ہو' چنانچہ توریت میں صراحت ہے:

تو اپنے بیٹے اسحاق کو' جو تیرا اکلوتا ہے' اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر

موریان کے ملک میں جا۔(۱۵)

دوسری جگہ ہے:

تو نے ایسا کام کیا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو بچا نہیں رکھا''(۱۶)

لیکن دوسری طرف حقیقت یہ ہے کہ حضرت اسحاق کی پیدائش حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد ہوئی، اسی بنا پر حضرت اسحاق علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے صاحبزادے ہیں' لہٰذا وہ اپنی پیدائش کے وقت کسی طرح بھی اکلوتے بیٹے نہ تھے' حالانکہ قربانی کی شرط یہ تھی کہ وہ ''اکلوتی'' اولاد ہو...... اور چونکہ پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام سے تیرہ برس بڑے ہیں' اس طرح وہ گویا تیرہ برس تک حضرت ابراہیم کی اکلوتی اولاد رہے......

علاوہ ازیں خود توریت اس پر گواہ ہے کہ اسماعیل اپنے والد محترم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی تمام اولاد سے زیادہ پیارے اور محبوب تھے...... مثال کے طور پر' عین اس موقع پر جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی خوش خبری دی اور جو موقع اس آنے والے بچے کے لیے اظہار مسرت و شادمانی کا تھا' حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بڑے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یاد کرتا ہوا پاتے ہیں' توریت تو ہے:

''اور ابراہیم نے خدا سے کہا کہ کاش اسماعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے' تب خدا نے فرمایا...... اور اسماعیل کے حق میں بھی' میں نے تیری دعا سنی''۔(۱۷)

الغرض...... اکلوتے ہونے' پہلوٹھے اور چہیتا ہونے کے اعتبار سے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی' آسمانی وحی کے الفاظ کا مصداق ہیں' مگر یہودیوں نے ان کی جگہ ذبیح کے لیے حضرت اسحاق علیہ السلام کا نام شامل کر دیا۔

(3) نذر اور قربانی کے الفاظ:

علاوہ ازیں ''ملت ابراہیمی'' میں قربانی یا نذر چڑھانے کے لیے ''خدا کے

سامنے پیش کرنے'' یا خدا کے ساتھ جینے وغیرہ کے استعمال ہوتے تھے' جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ''لادیوں'' کے متعلق اسی قسم کی تاکید فرمائی تھی' چنانچہ توریت میں ہے:

''اور ہارون لادیوں کو بنی اسرائیل کی طرف سے ہلانے کی قربانی کے لیے خداوند کے حضور گزارنے''...... (۱۸)

اور توریت کی رو سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ الفاظ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسبت ارشاد فرمائے تھے' نہ کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے لیے' چنانچہ تکوین میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی خبر دی تو انہوں نے فرمایا:

''کاش اسماعیل تیرے سامنے زندہ رہتا'' (۱۹)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے' نہ کہ حضرت اسحاق علیہ السلام۔

(4) ترکے میں عدم اشتراک:

مزید براں یہودی شریعت کی رو سے جس شخص یا جس خاندان کو اللہ تعالیٰ کی خدمت کے لیے یا اس کی راہ میں قربانی کے لیے مختص کیا جاتا' اسے والد کے ترکے میں سے حصہ نہ ملتا تھا' جیسا کہ مذکورہ بالا لادیوں کے متعلق توریت میں صراحت ہے:

''یہی وجہ ہے کہ لادیوں کو اپنے بھائیوں کے ساتھ کوئی حصہ اور ترکہ نہیں ملا کیونکہ ان کا حصہ خدا ہے'' (۲۰)

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا تمام ترکہ حضرت اسحاق علیہ السلام (یا اپنی دوسری اولاد) کو دیا' جبکہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو محض کھجوروں کا ایک تھیلہ اور پانی کا ایک مشکیزہ دے کر گھر سے رخصت کیا' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پہلے دن سے ہی یہ بات طے تھی کہ ''راہ خداوندی'' میں ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ہوں گے' نہ کہ حضرت اسحاق علیہ السلام۔

(5) قربانی کی یادگار:

یہ واقعہ ہی انوکھا اور منفرد نوعیت کا تھا' اسی لیے خود توریت کی رو سے' اللہ تعالیٰ نے بہت سے باتوں کو اس کی ''یادگار'' کے طور پر باقی رکھا ہے۔ یہ تمام یادگاریں' خاندان اسماعیل میں آخر وقت تک محفوظ رہیں' مگر خاندان اسحاق (بنو اسرائیل) میں ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا' یہ یادگاریں درج ذیل ہیں:

1___ کلمات حاضری:

لبیک اللھم لبیک (اے اللہ میں حاضر ہوں).

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بیٹے کی قربانی کا حکم دینا چاہا' تو پکارا' اے ابراہیم' تو حضرت ابراہیم نے کہا: میں حاضر ہوں''(۲۱)

حج وعمرہ میں جو تلبیہ پڑھا جاتا ہے' اس میں بار بار ''لبیک'' کا لفظ دہرایا جاتا ہے' جس کا ترجمہ ہے:

''اے اللہ میں حاضر ہوں''

اس سے بھی معلوم ہوا کہ قربانی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ہوئی تھی نہ کہ حضرت اسحاق کی۔

2___ بالوں کا نہ کتروانا:

توریت کی رو سے جو لوگ قربانی کی نذر مانتے تھے' وہ ایام نذر تک اپنے بال نہیں کٹواتے تھے' حج وعمرہ کرنے والے بھی احرام کی تکمیل تک بال نہیں کٹواتے ......

قرآن کریم میں ہے:

وَلَا تَحْلِقُوا رُؤُسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّه...... (۲۲)

اور تم اپنے سر نہ منڈواؤ' جب تک کہ قربانی کا جانور' اپنے ذبح ہونے کی جگہ تک نہ پہنچ جائے۔

یہ بھی دراصل اسی قربانی کی یادگار ہے' جو اولاد اسماعیل میں اب تک پائی جاتی ہے۔

3___ طواف کعبہ:

قدیم اسرائیلی مذہب میں یہ بھی دستور تھا کہ جس شخص کو قربان گاہ پر قربان کرتے تھے' وہ بار بار ''معبد'' یا قربان گاہ کے چکر لگاتا تھا...... چنانچہ حج وعمرہ میں سات بار صفا ومروہ کے درمیان چکر لگانا بھی' اسی واقعے کی یادگار ہے۔

4___ قربانی:

اس کے علاوہ ''حج'' کی ایک اہم یادگار قربانی بھی ہے' جسے اللہ تعالیٰ نے اسی واقعے کی یادگار کے طور پر برقرار رکھا ہے' قرآن حکیم میں ہے:

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (۲۳) اور ہم نے اس (اسماعیل) کے بدلے ایک بڑی قربانی قائم کی۔

مفسرین کے مطابق اس سے مراد سنت قربانی ہے' جو دنیا بھر کے مسلمان اس عظیم قربانی کی یادگار کے طور پر ہر سال پیش کرتے ہیں۔ قربانی کا یہ مہتم بالشان عمل بھی' اس بات کا زبردست ثبوت ہے کہ قربانی کا واقعہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا تھا' نہ کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے ساتھ۔

الغرض حج وعمرہ اور ان کے تمام مناسک اپنے اندر اس واقعے کی یادگار کا پہلو اتنی شدت اور عمدگی کے ساتھ رکھتے ہیں کہ اس کے بعد مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں ملتی۔

6___ خدمت خانۂ خدا:

پھر' جیسا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سوانح نگاروں اور مؤرخین نے صراحت کی ہے' کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ''قربانی'' دراصل ایک اور بڑے مقصد کے لیے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا انتخاب تھا اور وہ بڑا مقصد'' خانۂ خداوندی'' کی خدمت ہے...... اور تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ یہ عظیم الشان حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ذات سے پورا ہوا' نہ کہ حضرت اسحاق ؑ سے۔

5__ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا جذبۂ قربانی:

اس موقع پر، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیغمبرانہ عظمت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آتا ہے، وہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عظمت و پارسائی کے سامنے بھی، انسانی ذہن سرنگوں ہو جانے پر مجبور ہو جاتا ہے، اس لیے کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام والد ہونے کی حیثیت سے اس عمل کے لیے تیار ہوئے، تو یہ ان کی پیغمبرانہ عظمت تھی، حیرانی تو ننھے اسماعیل کے جذبۂ قربانی پر ہے کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ قربان کیے جانے کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کیا، بلکہ سراپا تسلیم و رضا بن کر قربان کیے جانے پر تیار ہو گئے، جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے صبر و رضا کی تعریف فرمائی ہے۔

شاعر مشرق علامہ اقبال نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اس جذبے پر تعریف آمیز حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے:

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

(4) قرآن حکیم اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اوصاف کریمانہ:

قرآن حکیم میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اوصاف و کمالات نبوت کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا (۲۴)	اور اسماعیل کو (اس) کتاب میں یاد کر، بے شک وہ وعدے کا سچا اور نبی مرسل ہے اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور (ادائیگی) زکوٰۃ کا حکم دیا کرتا تھا اور وہ اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ شخص تھا۔

روایات کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے قبائل جرہم، عمالیق اور اہل یمن...... (دوسرے لفظوں میں ''اہل عرب'') کی طرف بطور نبی مبعوث فرمایا تھا۔ (۲۵)

مذکورہ بالا ارشاد باری تعالیٰ سے گمان ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ملنے والے صحیفے اور ان کو عطا ہونے والی شریعت تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہو چکی ہے' البتہ دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تک ان کی باقیات کی موجودگی' اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے نہایت محنت' لگن اور جاں فشانی سے فرائض نبوت و رسالت انجام دیئے تھے.

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اوّلیات

تاریخ عالم میں حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنی اولیات کے باعث بھی خاصی شہرت رکھتے ہیں...... انہوں نے حسب ذیل نیک اور عمدہ کاموں کی بنیاد رکھی کی.

(1) تاسیس خانہ کعبہ:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے والد محترم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مل کر "اللہ تعالیٰ" کے اولیں اور سب سے زیادہ بابرکت اور سب سے زیادہ مقدس گھر کی "بنیاد رکھی"' جسے دنیا کے قدیم ترین اور عظیم ترین "بیت الہٰی" ہونے کا اعزاز حاصل ہے.

قرآن کریم میں اس واقعے کی خبر دیتے ہوئے ارشاد ہے:

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهِمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمٰعِيلُ ط رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (٢٦)	اور (اس وقت کو یاد کیجئے) جب ابراہیم اور اسماعیل "بیت اللہ" کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (اور کہہ رہے تھے): پروردگار ہماری طرف سے اسے قبول فرما' بلا شبہ تو ہی سننے والا' جاننے والا ہے.

روایات کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام بیت اللہ شریف کی تعمیر کر رہے تھے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام انہیں پتھر اور گارا وغیرہ لا لا کر دے رہے تھے......

اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے' خصوصی طور پر انہیں ایک "پتھر" مرحمت فرمایا گیا اور اس میں ایسی تاثیر پیدا کی گئی کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو' جہاں تک وہ اوپر اٹھنا چاہتے' اٹھا کر لے جاتا تھا...... اس طرح باپ بیٹے دونوں نے مل کر خانۂ خدا کی تعمیر فرمائی...... (٢٧) اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر مبارک تیس

برس (اور حضرت ابراہیم کی ۱۱۶ برس تھی)۔(۲۸)

(2) خدمت کعبہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام تو ''تعمیر خانہ کعبہ'' کے بعد واپس حران (الخلیل)، فلسطین چلے گئے' جبکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنی تمام عمر اسی جگہ بسر فرمائی اور اپنی وفات تک' جو مؤرخین کے مطابق ۱۳۷ برس کی عمر میں اسی مقام پر ہوئی' برابر اسی جگہ رہائش پذیر رہے' اور عمر بھر اسی گھر کی خدمت انجام دیتے رہے' اس طرح انہیں تاریخ میں پہلے ''خادم الحرم'' ہونے کا شرف حاصل ہوا۔(۲۹)

(3) گھڑ سواری:

بقول حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ علمائے انساب اور مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا کی تاریخ میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے گھڑ سواری کی اور گھوڑوں کو سواری کے لیے سدھایا۔ انہوں نے سعید بن یحییٰ الاموری صاحب مغازی سے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اتخذوا الخیل واعتقوھا فانھا میراث ابیکم اسماعیل (۳۰)	گھوڑے خریدا کرو اور انہیں سدھاؤ' اس لیے کہ یہ تمہارے جدامجد اسماعیل علیہ السلام کی میراث ہے۔

روایات کی رو سے ان سے پہلے گھوڑا محض ایک جنگلی جانور تھا۔

(4) تیر اندازی:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایک اور نمایاں یادگار تیر اندازی بھی ہے۔ جس کا ذکر توریت اور احادیث دونوں جگہ ملتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن کچھ انصاری نوجوانوں کو تیر اندازی کی مشق کرتے ہوئے بھی دیکھا' تو فرمایا:

ارموا فان اباکم کان رامیا (۳۱)	تم تیر اندازی کرو' اس لیے کہ تمہارا باپ (اسماعیل) بھی تیر انداز تھا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تیر اندازی کا ذکر توریت میں بھی ملتا ہے۔ لکھا ہے:

''اور خداوند اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بیابان میں رہنے لگا اور وہ تیر انداز بنا۔'' (تکوین: ۲۲/۲۱)

(5) شہر محبوب کی آباد کاری:

سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے ابواب فضائل میں سے' ایک اہم ترین باب' اُس ''شہر جاناں'' کی آباد کاری کا بھی ہے جس کی طرف جانے کے لیے دنیا بھر کے اہل وفا اور سالکان راہ عشق و محبت کے دل ہمیشہ بے تاب اور بے چین رہتے ہیں...... قرآن کریم میں صراحت ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ان دونوں ماں بیٹوں کو وہاں لے کر آئے تھے' تو اس سے ان کا مقصد اس ''شہر'' کی آباد کاری ہی تھا' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجۡعَلۡ اَفۡئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ وَارۡزُقۡہُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ (۳۲)

(حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا): اے پروردگار: میں نے اپنی کچھ اولاد کو تیرے محترم گھر کے قریب' اس میدان میں بسایا ہے' جہاں کھیتی باڑی نہیں ہوتی' اے پروردگار تاکہ وہ نماز قائم کریں' سو تو انسانوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے اور تو انہیں کھانے کے لیے ہر قسم کے پھل دے' تاکہ وہ شکر گزار بنیں۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی برکت اور تاثیر ہے یا پھر ان کی پاک و معصوم اولاد کے عظیم جذبوں کا نتیجہ' کہ وہ خطہ جو ایک خشک و بے آباد میدان تھا آج دنیا کا سب سے زیادہ محترم اور سب سے زیادہ قابل کشش مقام ہے۔ جہاں اس وقت کوئی پھل یا پھول پیدا نہیں ہوتا تھا' وہاں آج دنیا بھر کے پھل اور فواکہ ہر موسم اور ہر سیزن میں فراواں مقدار میں اور باافراط نظر آتے ہیں۔ جہاں اس وقت کوئی پرندہ پر نہیں مارتا تھا وہاں آج دن ہو' یا رات ہمہ وقت چراغاں رہتا ہے...... جہاں ابراہیم

علیہ السلام کو' اپنی اولاد کے لیے خطرات محسوس ہو رہے تھے وہاں آج دنیا میں سب سے زیادہ امن وسکون کا دور دورہ ہے۔

(6) عربی زبان کا استعمال:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانے میں بہت سے عرب قبائل موجود تھے' جو یقیناً عربی بولتے تھے' حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے خاندان کے پہلے فرد تھے' جنہوں نے عربی زبان بولی' اور اس کو استعمال کیا...... حدیث شریف میں ہے **وتعلم العربية منهم** (۴۳) اور انہوں نے بنو جرہم سے عربی زبان سیکھی' اس طرح حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

وانه اول من تعلم بالعربية الفصيحة البليغة..... (۴۴) اور وہ پہلے شخص ہیں' جنہوں نے فصیح عربی زبان بولی۔

ابن سعد نے محمد بن علی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے تیرہ برس کی عمر میں عربی زبان بولنا شروع کر دی تھی اور اس سے پہلے خاندان کے لوگ عبرانی بولتے تھے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وفات اور ان کا زمانہ:

مؤرخین کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر مبارک جب ۱۳۷ برس کی ہوئی اور ان کی اولاد نے بیت اللہ شریف اور وہاں آنے والے زائرین کی خدمت کا کام اچھی طرح سنبھال لیا' تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے پاس بلا لیا' چنانچہ انہیں ان کی والدہ کے پہلو میں ''میزاب رحمت کے عین نیچے حطیم کے اندر دفن کیا گیا'' (۴۵) ابن سعد نے اسحاق بن عبداللہ بن ابی فروہ سے یہ نقل کیا ہے:

''تین انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر معلوم نہیں ہے' حضرت اسماعیل علیہ السلام کی' جو میزاب رحمت اور رکن اور بیت اللہ شریف کے درمیان واقع ہے: حضرت ہود علیہ السلام کی' جو یمن کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ کے نیچے ''ریت'' کے ٹیلے میں ہے اس پر تندی کا ایک پودا ہے' اور وہ جگہ شدید ترین گرم علاقے میں

ہے اور رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک۔ ان قبروں کی جگہ کا تعین صحیح ہے۔ (۳۶)

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبر مبارک پر سبز مستطیل محرابی شکل کا سنگ مرمر لگایا گیا تھا' جس کی چوڑائی ۱۲/۲ انچ تھی' اس سے تقریباً سات بالشت کے فاصلے پر رکن عراقی کی جانب حضرت ہاجرہ استراحت فرما رہی ہیں...... ان کی قبر پر گول سنگ مرمر لگایا گیا تھا۔ (۳۷)

تاریخ المکۃ المکرمہ کے مؤلف' مولانا محمد عبدالمعبود کے مطابق' ۱۳۹۴ھ / ۱۹۷۵ء میں انہوں نے ان دونوں بزرگوں کی قبروں کے نشان دیکھے تھے' جن پر لوگوں کے کثرت سے نماز پڑھنے کے باعث گڑھے پڑ گئے تھے' (۳۱) البتہ ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۶ء میں حطیم کا نیا فرش بناتے وقت ان قبروں کے امتیازی نشانات ختم کر دیئے گئے ہیں...... اور اب یہ دونوں بزرگ ...... بے نام اور بے نشان کی ایسی قبروں میں استراحت فرما ہیں' جہاں ہر وقت رب کعبہ کے حضور سجدہ ہائے نیاز پیش کرنے اور طواف کرنے والوں کا ہجوم رہتا ہے...... (۳۸)

مؤرخین کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت (بمقام کنعان' فلسطین) ۲۰۷۴ق ھ میں (تقریباً ۲۶۹۴ ق ھ) میں اور وصال (بمقام مکہ مکرمہ) ۱۹۳۷ ق م (تقریباً ۲۵۵۹ ق ھ) میں ہوا...... گویا آنحضور ﷺ کی بعثت مبارکہ کے وقت اس واقعے کو ساڑھے ۲۵ صدیاں بیت چکی تھیں...... (۳۹)

خانہ کعبہ کی تعمیر مکمل ہونے پر حضرت اسماعیل علیہ السلام جوار کعبہ میں آباد ہو گئے۔ ان کی نیک نیتی اور ان کے والد محترم کے اخلاص کا یہ نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بنو جرہم کی صورت میں ان کے حامی اور مددگار عطا فرما دیئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اسی خاندان سے عربی سیکھی اور اسی خاندان میں ایک سے زیادہ شادیاں کیں۔ ان کی دو بیویوں کا ذکر احادیث مبارکہ میں ملتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ملنے کے لیے آئے تو وہ گھر پر موجود نہ تھے۔ حضرت ابراہیم نے ان کی بیوی سے گھر کے معاشی حالات پوچھے، تو بیوی نے تنگ دستی اور افلاس کی شکایت کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی یہ باتیں پسند نہ آئیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ اپنے خاوند کو میرا سلام کہنا اور پیغام دینا کہ اپنے گھر کی چوکھٹ بدل لے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پیغام سنا تو اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔

دوسری مرتبہ جب والد بزرگوار آئے۔ اور گھریلو حالات پوچھے تو بیوی نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے بہت اچھی گزر بسر ہو رہی ہے۔ جس پر انہوں نے پیغام دیا کہ گھر کی چوکھٹ کو قائم رکھیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانیوں کا صلہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نیک اور آبرومند اولاد کی صورت میں دیا۔ چنانچہ ان کی اولاد شمالی عرب میں پھیل گئی۔ اور عرب مستعربہ کی صورت میں عرب کے جغرافیا، ادب اور ثقافت پر چھا گئی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ہاں بارہ بیٹے پیدا ہوئے۔ جن میں شمالی عرب میں زیادہ تر عربوں کے مورث اعلیٰ "قیدار" سب سے زیادہ مشہور ہیں یہی قیدار نبی اکرم ﷺ کے جدامجد ہیں۔

ان کے حالات پر مزید تفصیل آئندہ ابواب میں دی جا رہی ہے۔

حوالہ جات وحواشی

(۱) الصافات' ۱۱۳/۳۷.

(۲) تکوین' ۱۷/۱۹-۲۰.

(۳) تکوین ۱۶/۱۰.

(۴) تکوین ۱۶/۱۲.

(۵) القرآن الکریم الصافات (۱۰۱/۳۷).

(۶) البخاری' ۳۹۶/۶۔ (کتاب الانبیا' باب ۹: یزفون......) حدیث ۳۳۶۴؛ نیز دیکھیے: ابن کثیر' البدایہ' ۱۵۵/۱۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کے گھر سے روانگی کا جو نقشہ کھینچا ہے' اس میں' اس خاندان کی عظمت نظر آتی ہے' مگر دوسری طرف توریت میں اسے محض دو سوکنوں کا جھگڑا دکھایا گیا ہے: لکھا ہے:

''ساری نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو اس کے ابراہام سے ہوا تھا' ٹھٹھے مارتا ہے' تب اس نے ابراہام سے کہا کہ اس لونڈی اور اس کے بیٹے کو نکال دے' کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے اصحاق کے ساتھ وارث نہ ہو گا۔ پر ابراہام کو اسی کے بیٹے کے باعث یہ بات نہایت بری معلوم ہوئی اور خدا نے ابراہام سے کہا کہ تجھے اس لڑکے اور اپنی لونڈی کے باعث برا نہ لگے جو کچھ سارہ تجھ سے کہتی ہے تو اس کی بات مان''۔ (تکوین ۱۲/۲۱).

(۷) البخاری' ۳۹۶/۶-۳۹۷ (کتاب الانبیا' باب ۹)' حدیث ۳۳۶۴۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے' توریت کا بیان اس سے قطعی طور پر مختلف ہے... توریت کے الفاظ یہ ہیں:

''تب ابراہیم نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا' بلکہ اسے اس کے کندھے پر دھر دیا اور لڑکے کو بھی اس کے حوالے کر کے اسے رخصت کر دیا' سو وہ چلی گئی اور بیر سبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی اور جب مشک کا پانی ختم ہو گیا تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا اور اس کے سامنے ایک تیر کے ٹپے پر دور جا کر بیٹھی اور کہنے لگی کہ میں اس لڑکے کا مرنا تو نہ دیکھوں' سو وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی' اور چلا چلا کر رونے لگی' اور خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتہ نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا' اور اس سے کہا: اے ہاجرہ' تجھ کو کیا ہوا' مت ڈر' کیونکہ خدا نے اس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہے اس کی آواز سن لی ہے' اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال' کیونکہ میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا' پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا کنواں دیکھا اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑا ہوا' اور بیابان میں رہنے لگا' اور تیر انداز بنا اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا (تکوین ۲۱/۱۴-۲۱)''

اس عبارت سے صاف صاف پتہ چل رہا ہے کہ یہاں یہودیوں نے اپنے مخصوص طریقے پر حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں حقائق کو چھپانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ ورنہ نبی اپنی بیوی کو ''آوارہ پھرنے'' کے لیے کیسے چھوڑ سکتا ہے اور پھر تن تنہا ایک عورت ارض فلسطین سے چل کر صحرائے فاران میں کیسے آ سکتی ہے؟

(۸) البخاری' ۶/۳۹۶۔

(۹) الصٰفٰت (۳۷/۱۰۲-۱۰۷)۔

(۱۰) دیکھیے الصٰفٰت (۳۷/۱۱۲)۔

(۱۱) توریت کے الفاظ یہ ہیں:

''اور ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابراہیم کو آزمایا اور اسے کہا اے ابراہیم! اس نے کہا میں حاضر ہوں' تب اس نے کہا کہ تو اپنے بیٹے اسحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریان کے ملک میں لے جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر' جو میں تجھے بتاؤں گا' سوختنی قربان کے طور پر چڑھا' تب ابراہیم نے

صبح سویرے اٹھ کر اپنے گدھے پر چار جامہ کسا...... وہاں ابراہیم علیہ السلام نے قربانی گاہ بنائی اور اس پر لکڑیاں چنیں اور اپنے بیٹے اسحاق کو باندھا اور اسے قربان گاہ پر لکڑیوں کے اوپر رکھا اور ابراہیم نے ہاتھ بڑھا کر چھری لی کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرے، پھر خداوند کے فرشتہ نے اسے آسمان سے پکارا کہ اے ابراہیم اے ابراہیم! اس نے کہا میں حاضر ہوں، پھر اس نے کہا تو اپنے ہاتھ لڑکے پر نہ چلا اور نہ اس سے کچھ کر کیونکہ میں اب جان گیا کہ تو خدا سے ڈرتا ہے، اس لیے کہ تو نے اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے، مجھ سے دریغ نہ کیا (تکوین، ۲۲/۱-۱۴)۔"

(۱۲) گنتی، (۸/۱۷)۔

(۱۳) "اور ہابل بھی اپنی بھیڑ بکریوں کو کچھ پہلوٹھے بچوں کا اور کچھ ان کی چربی کا ہدیہ لایا" (تکوین، ۴/۴)۔

اگر کسی مرد کی دو بیویاں ہوں اور ایک محبوبہ ہو اور دوسری غیر محبوبہ، دونوں سے لڑکے ہوں اور پہلوٹھا بیٹا غیر محبوبہ سے ہو، تو جب وہ اپنے بیٹوں کو اپنے مال کا وارث کرے تو وہ محبوبہ کے بیٹے کو غیر محبوبہ کے بیٹے پر جو فی الحقیقت پہلوٹھا ہے، فوقیت دے کر پہلوٹھا نہ ٹھہرائے...... کیونکہ اس کی قوت کی ابتدا ہے اور پہلوٹھے کا حق اسی کا ہے۔

(۱۴) قضاۃ، اصحاح، ۱۳-۴۔

(۱۵) تکوین ۲۲/۱۔

(۱۶) تکوین، ۲۲/۱۲۔

(۱۷) تکوین، ۱۷/۱۷۔

(۱۸) گنتی، ۸:۱۲-۱۲۔

(۱۹) تکوین، ۱۷/۱۷۔

(۲۰) گنتی، باب ۸۔

(۲۱) تکوین، ۲۲/۱۔

(۲۲) البقرہ (۲/۱۹۶)۔

(۲۳) الصافات (۳۷/۱۰۷)۔

(۲۴) مریم (۱۹/۵۴-۵۵).

(۲۵) ابن سعد' ۱/۳۲.

(۲۶) البقرہ (۲/۱۲۷).

(۲۷) ابن سعد' ۱/۳۳.

(۲۸) ایضاً.

(۲۹) حضرت اسماعیل کی ''خدمت کعبہ'' کا تذکرہ خود قرآن کریم میں موجود ہے' دیکھیے البقرہ (۲/۱۲۵) اور اس کی تفاسیر.

(۳۰) البدایہ' ۱/۱۹۲.

(۳۱) احمد بن حنبل' مسند' (مسند انس بن مالک).

(۳۲) ابراہیم' (۱۴/۳۷). لیکن اس وقت وہاں بھی حالات بدل رہے ہیں۔ میدان عرفات میں زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں تیار کر کے لگائے پودے اور عجیب بہار دکھاتے ہیں اور مکہ مکرمہ کے گلی کوچوں میں لگائے گئے پودے ''شہر جاناں'' کی رونق میں اضافہ کر رہے ہیں۔

(۳۳) البدایہ' ۱/۱۹۳...... البتہ ابن سعد نے محمد بن السائب الکلبی کے حوالے سے جو اپنے والد سے نقل کرتے ہیں' اس بات کی تردید کی ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے عربی بولی تھی' اور لکھا ہے کہ ان سے پہلے رعلہ بنت یشجب کی اولاد نے عربی بولی تھی، لیکن ہمارے خیال میں یہ تردید بلا جواز ہے' اس لیے کہ بنو جرہم' جو ایک عرب قبیلہ تھا' حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا قریبی ہمسایہ اور بعد میں ان کا سسرالی خاندان تھا' یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اس قبیلے کے افراد کے ساتھ اپنی مادری زبان ''عبرانی'' میں گفتگو کرتے ہوں گے؟ خصوصاً جبکہ وہ ان کی طرف اللہ تعالیٰ کے نبی بھی تھے اور قرآن حکیم کی شہادت یہ ہے کہ ہر نبی اسی قوم کی زبان میں مبعوث ہوا' جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اسے بھیجا تھا...... پھر الکلبی کا اپنا پایہ بھی محل نظر ہے...... اس لیے ہمارے خیال میں اول الذکر روایت ہی درست ہے (واللہ اعلم)

(۳۴) ابن سعد' ۱/۳۳.

(۳۵) ابن سعد' ۱/۳۳.

(۳۶) ابن بطوطہ' تحفۃ النظار ..... ص ۱۹۷.

(۳۷) تاریخ المکۃ المکرمہ' ۱/۱۱۲.

(۳۸) ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۴ء اور ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۶ء میں راقم الحروف' جب اپنی اہلیہ کے ہمراہ زیارت و حاضری کعبہ سے مشرف ہوا تو اس جگہ کسی قبر کا کوئی نشان نہیں تھا اور غالباً حجاج کرام اور زائرین میں سے ننانوے فیصد لوگوں کو یہ علم نہیں ہے کہ ان بزرگوں کے ''مزارات'' کہاں واقع ہیں؟

(۳۹) تاریخ مکہ' ۱/۸۲۔ بحوالہ ابن جریر' تفسیر (اردو ترجمہ)

باب 4

مکہ مکرمہ...... کی تاریخ

اس سے قبل کہ ہم حضرت اسماعیل کی اولاد کے حالات پر گفتگو کریں مکہ مکرمہ اور کعبۃ معلیٰ کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مکہ مکرمہ کا قدیم نام ''بکہ'' تھا مرورِ ایام سے باء میم سے بدل گئی' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (۱)	بے شک پہلا گھر' جو لوگوں نے بنایا گیا ہے وہ ہے جو' بکہ میں ہے' بابرکت اور جہانوں کے لیے سرچشمۂ ہدایت۔

اس کی ''اصل'' کے متعلق محققین کے مابین اختلاف ہے...... نامور عرب لغت نویس ابن منظور اور الزبیدی نے اس کا وہ مادہ مکک (م۔ک۔ک) قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ ''مکک'' کے معنی دھکیلنے اور جذب کرنے کے ہیں اور چونکہ اس شہر دلربا میں یہ دونوں خاصیتیں پائی جاتی ہیں' یہاں کثرت ازدحام کے باعث دھکے بھی لگتے ہیں اور یہ دلوں کو اپنی طرف جذب بھی کرتا ہے' اس لیے کہ اس کا یہ نام قرار پایا...... ابن منظور نے اس کی وجہ تسمیہ کے طور پر یہ اقوال نقل کیے ہیں:

قیل سمیت بذالک لقلة مائها وذالک انهم یمتکون الماء فیها ای یستخرجونه	کہا جاتا ہے کہ اس کا نام ''مکہ'' اس میں پانی کی کمی کی بنا پر رکھا گیا ہے' اس لیے کہ لوگ یہاں بڑی مشکل سے پانی نکالتے تھے۔

(۲) ہلاکت:

بعض علما نے لکھا ہے کہ مکک کے معنی ہلاکت کے ہیں۔ ابن منظور لکھتے ہیں:

سمیت بمکة لانها کانت تمک من ظلم فیها واعتدی ای تهلکه

اسے اس لیے مکہ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ہر اس شخص کو، جو اس میں ظلم کرتا تھا' ہلاک کر دیتا تھا.

(۳) مکہ اور بکہ میں فرق:

لغت دانوں نے مکہ اور بکہ میں بھی فرق کیا ہے' ابن منظور لکھتے ہیں:

مکة الحرم کله فاما بکه فهو مابین الجبلین

مکہ تو تمام حرم کا نام ہے اور رہا بکہ' تو وہ پہاڑوں کے درمیان والا علاقہ ہے.

(۴) قرض خواہ سے' وصولی قرض کا اصرار:

''مکہ'' کے مادے ''مکک'' کے ایک اور معنی قرض خواہ سے وصولی قرض کے لیے اصرار بھی ہیں، ابن منظور الافریقی لکھتے ہیں:

وتمکمک علی الغریم الح علیه فی اقتضاء الدین وغیره و فی الحدیث عن النبی صلی الله علیه وسلم لا تمککو علی غرمائکم......

اور مکک کے معنی کسی قرض خواہ سے' وصولی قرض پر اصرار کرنے کے ہیں اور حدیث نبوی میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے مقروض سے' وصولی قرض کے لیے اصرار مت کرو.

یہاں آنے والے زائرین چونکہ اپنی مغفرت اور اپنی حاجات کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے الحاح و زاری اور اپنی مغفرت کے لیے اصرار کے ساتھ دعا کرتے ہیں' اس لیے اس کا یہ نام پڑ گیا.

(۵) دھکے لگنا:

المکمکۃ التدحرج فی المشی [۲] المکمکۃ کے معنی چلنے کے دوران میں دھکے لگنا ہیں۔

چونکہ یہاں آنے والے لوگوں کو بھیڑ اور لوگوں کی کثرت کے باعث چلنے میں دھکے لگتے ہیں اس لیے اس کا نام پڑا۔

(۶)......مقام گریۂ وبکاء:

بعض علما نے صراحت کی ہے کہ دراصل یہ لفظ ''بکہ'' تھا...... جو کہ بکاء سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ''رونے'' اور ''گریہ'' کرنے کے ہیں، یہاں چونکہ لوگ کثرت سے روتے ہیں، اس اعتبار سے یہ مقام گویا مقام گریۂ وبکا ہے، اس لیے اسے یہ نام دیا گیا ہے.

تاہم مؤرخین نے اس بات کی صراحت کی ہے، کہ جب یہ شہر مقدس پہلی مرتبہ بسایا گیا تو اس وقت اس کا کوئی بھی نام نہ تھا...... نامور محقق سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''سب سے اول یہ سمجھنا چاہیے کہ عرب، حجاز، مکہ اور کعبہ جتنے الفاظ اور اسماء ہیں اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہوئے تھے، لفظ عرب دسویں صدی قبل مسیح میں مستعمل ہوا (دیکھو جغرافیہ بطلیموس)۔ حجاز کا لفظ تو اس سے بھی زیادہ مستحدث (نیا) ہے اور مکہ کا نام تو دوسری صدی میں بطلیموس (۳) کے ہاں سب سے پہلے ''مکاربا'' کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے توریت میں اس مقام کا نام اولاً ''مدبار'' یعنی ''بادیہ'' (صحراء) بتایا گیا ہے اور قرآن مجید نے اسی کو وادی غیر ذی زرع (بن کھیتی کی زمین) کہا ہے، اس کے سوا مکہ شریف کی آبادی کے وقت اس کا کوئی دوسرا نام نہیں تھا، مدت کے بعد یہی لفظ ''مدبار'' بادیۂ وصحرا اور وادی غیر ذی زرع اس سرزمین کا نام قرار پایا۔'' لفظ عرب کے لفظی معنی بھی بادیہ اور صحرا کے ہیں، اسی طرح ''مدبار'' اور ''وادی غیر ذی زرع'' اور ''عرب'' سب ہم معنی الفاظ ہیں [۴]

ممالک عرب میں سب سے پہلا نام تورات میں مدیان (مدین) نظر آتا ہے۔ [۵]

فاران کی طرح مدین غیر معروف نہیں ہے۔ شہر مدین تحقیقی اور یقینی طور پر حجاز میں ساحل بحر احمر و عقبہ کے سرے پر واقع تھا اور اب تک اسی نام سے وہیں موجود ہے۔ قدیم تاریخ میں جہاں کہیں بھی مدیانی لوگوں کا ذکر ہے ساتھ ہی اتحاد نام کے ساتھ اسماعیلیوں کا بھی ذکر ہے' بلکہ تورات نے اکثر دونوں کو ایک سمجھا ہے.(٦)

اور یہ بات واضح ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے قبل "کعبہ معلیٰ" موجود تھا' تو یقیناً مکہ مکرمہ بھی موجود ہوگا.

زبور کا بیان:

اس شہر مبارک کی قدامت کا مزید اندازہ زبور کے اُس بیان سے ہوتا ہے' جس میں' حضرت داؤد علیہ السلام نے اس شہر مبارک کا صاف وصریح لفظوں میں تذکرہ کیا ہے:

اے لشکروں کے خداوند!
تیرے مسکن کیا ہی دلکش ہیں
میری جان خداوند کی بارگاہوں کی مشتاق ہے' بلکہ گداز ہو چلی
میرا دل اور میرا جسم زندہ خدا کے لیے خوشی سے للکارتے ہیں
اے لشکروں کے خداوند! اے میرے بادشاہ اور میرے خدا میرے مذبحوں کے پاس گوریا نے اپنا آشیانہ اور ابابیل نے اپنے لیے گھونسلہ بنا لیا.
جہاں وہ اپنے بچوں کو رکھے
مبارک ہیں وہ جو تیرے گھر میں رہتے ہیں
وہ سدا تیری تعریف کریں گے
مبارک ہے وہ آدمی جس کی قوت تجھ سے ہے'
جس کے دل میں صیون کی شاہراہیں ہیں'
وہ وادی بکا سے گزر کر اسے چشموں کی جگہ بنا لیتے ہیں'
بلکہ پہلی بارش اسے برکتوں سے معمور کر دیتی ہے'
وہ طاقت پر طاقت پاتے ہیں.(٨)

اس اقتباس میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن سے واضح طور پر ''وادی مکہ'' ہی پر قاری کی نگاہ ٹھہرتی ہے اور یہی سرزمین اس کا مصداق قرار پاتی ہے' مثال کے طور پر' اس میں ''وادی بکا (یا بکہ)'' کا ذکر ہے' جو کہ ''مکہ مکرمہ'' کا قدیم نام ہے۔ اس کے علاوہ ''مورہ'' کا ذکر ہے' جو کہ عربی کا لفظ ''مروہ'' کی بگڑی ہوئی صورت ہے اور چشمے کا تذکرہ ہے' جو کہ چاہ زمزم ہے' ان تمام قرائن کے باوجود اگر کوئی شخص' اس کا مصداق کسی اور مقام کو قرار دے' تو اس کی عقل پر رونے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

یہ تو تحریف شدہ توریت کی عبارت ہے' مولانا یعقوب حسن نے...... ''اصل عبرانی'' الفاظ نقل کر کے' ان کا حسب ذیل ترجمہ کیا ہے:

عبری بعمق ھبکۃ معین یسیتو ھو گم برکوت یغطہ مورہ......	لوگ بکہ کی وادی میں چلتے ہوئے ایک کنوئیں کے پاس ٹھہرتے ہیں جملہ برکتیں مورہ (مروہ) کو ڈھانپے رہتی ہیں۔ (۹)

حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ ۱۰۱۰-۹۷۰ ق م ہے' جس کا مطلب ہے کہ اس زمانے میں ''مکہ مکرمہ'' اور بیت اللہ شریف اتنے معروف تھے کہ حضرت داؤد علیہ السلام جیسے عظیم المرتبت نبی نے اپنی مقدس نظموں میں اس کا تذکرہ بڑے جذب و شوق کے ساتھ کیا ہے۔

وادی غیر ذی زرع کے انتخاب کی وجہ:

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب دنیا میں بڑے بڑے مہذب اور متمدن شہر موجود تھے' جن میں' وادی نیل کا ہزاروں سالہ قدیم تہذیبی مقام' وادی دجلہ' فرات میں واقع بابل و نینوا کے متمدن مراکز' اور وادی سندھ کی ہزاروں سالہ قدیم تہذیب و تمدن کی جلوہ گاہیں شامل ہیں' مگر ان سب کو چھوڑ کر ''بیت اللہ'' کی تعمیر کے لیے' ایک بے آب و گیاہ میدان اور صحرائی علاقے کا انتخاب کیوں کیا گیا؟......

مولانا شبلی نعمانی رحمہ اللہ اس سوال پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دنیا میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی' ایران' ھند' مصر اور یورپ میں عالمگیر

اندھیرا تھا' قول حق ایک طرف اس وسیع خطۂ خاک میں گز بھر بھی زمین نہیں ملتی تھی جہاں کوئی شخص خالص خدائے واحد کا نام لے سکتا' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب کلدان میں یہ صدا بلند کرنی چاہی تو آگ کے شعلوں سے کام پڑا۔ مصر آئے ناموس کو خطرہ کا سامنا ہوا۔ فلسطین پہنچے کسی نے بات تک نہ پوچھی' خدا کا نام جہاں لیتے تھے شرک اور بت پرستی کے غلغلہ میں آواز دب کر رہ جاتی تھی' معمورۂ عالم کے صفحے نقشہ ہائے باطل سے ڈھک چکے تھے اب ایک سادہ' بے رنگ' ہر قسم کے نقش و نگار سے معرّی ورق درکار تھا' جس پر طغرائے حق لکھا جائے' یہ صرف حجاز کا صحرائے ویران تھا' جو تمدن اور عمران کے داغ سے کبھی داغدار نہیں رہا تھا۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہؓ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو عرب میں لائے اور ان کو یہیں آباد کیا۔ حضرت سارہ (جیسا کہ توریت میں ہے) کچھ عرصہ کے بعد انتقال کر گئیں' حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ میں چلے آئے' حضرت اسماعیل علیہ السلام جوان ہو چکے تھے' اور اعلان حق میں ایک ہم آواز ہاتھ آیا' دونوں نے مل کر ایک چھوٹے سے چوکھونٹے گھر کی بنیاد ڈالی۔ (۱۰)

اس طرح بیت اللہ شریف کی تعمیر نو'' کم و بیش چار ہزار برس قبل عمل میں آئی' اس کے ساتھ ہی اس شہر محبت کی بنیاد پڑی' جسے خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کے مولد و مسکن ہونے کا شرف حاصل ہوا' اور جو ''مہبط وحی'' اور ''مرکز اسلام'' قرار پایا۔

(۲) محل وقوع:

اللہ تعالیٰ نے اپنے قدیم ترین گھر اور مرکز اسلام کے لیے جس بابرکت شہر کا انتخاب فرمایا وہ نہ صرف یہ کہ اپنے اندر سے پھوٹنے والی نورانی کرنوں کے باعث ''مرکز و قلب انسانیت'' کی حیثیت رکھتا ہے' بلکہ یہ شہر اپنے محل وقوع کے اعتبار سے بھی دنیا کے ''قلب و مرکز'' میں واقع ہے۔

مکہ مکرمہ کا محل وقوع معروف جغرافیا دان بطلیموس نے حسب ذیل لکھا ہے:

طول بلد ۷۸ درجہ اور عرض بلد ۳ درجہ

لیکن بطلیموس کا بیان کردہ ''محل وقوع''...... مسلم جغرافیادانوں کی تحقیقات کی رو سے غلط ہے' چنانچہ علامہ فرید وجدی نے اس کا محل وقوع حسب ذیل بیان کیا ہے:

طول بلد	عرض بلد	سطح سمندر کی بلندی
۴۰ درجہ ۹ دقیقہ	۲۱ درجہ ۲۸ دقیقہ	۳۳۰ میٹر (۱۱)

جبکہ علامہ شیخ طاہر کردی نے شیخ السباعی کی تحقیق نقل کرتے ہوئے اس کا درج ذیل محل وقوع بیان کیا ہے:

طول بلد	عرض بلد	سطح سمندر سے بلندی
۴۰ درجہ	۲۱ درجہ ۳۸ دقیقہ	۲۸۰ میٹر (۱۲)

علامہ کردی رحمہ اللہ نے اپنی تحقیق کے نتائج حسب ذیل بیان کیے ہیں:

طول بلد	عرض بلد	سطح سمندر سے بلندی
۳۹ درجہ ۳۱ دقیقہ	۲۱ درجہ ۲۵ دقیقہ	۳۳۰ میٹر (۱۳)

اس اختلاف کی وجہ غالباً پیائش کی جانے والی جگہ کا اختلاف ہوسکتا ہے' اس سلسلے میں چند دقیقوں کا اختلاف عام سی بات ہے.

مجموعی طور پر مکہ مکرمہ کا طول بلد' ۴۰ درجہ اور عرض بلد قریباً ۲۰ درجہ ہے...... اس تناسب پر' تبصرہ کرتے ہوئے نامور محقق قاضی سلیمان منصوری پوری لکھتے ہیں:

''کرۂ ارض پر آباد دنیا کا مجموعہ زیادہ سے زیادہ ۴۰ درجہ عرض بلد اور شمال میں زیادہ سے زیادہ ۸۰ درجے تک آباد ہے' دونوں کا مجموعہ ۱۲۰ درجہ ہے' جن کا نصف ۶۰ درجہ ہوتا ہے' جب ۶۰ کو ۸۰ درجہ شمال میں تفریق کریں تو بھی ۲۰ درجہ شمال ہے' اور مکہ معظمہ ۲۰ درجے پر آباد ہے' اس لیے کل کرہ ارض میں یہی وسط ہونے کا درجہ رکھتا ہے''.

لغات کی کتابوں میں اسے ''ناف زمین'' کہا گیا ہے''اور ناف بھی انسان کے جسم کے عین وسط میں نہیں ہوتی' بلکہ تقریباً وسط میں ہوتی ہے' یہی وجہ ہے کہ مکہ مکرمہ بھی وسط حقیقی کے قریب تر واقع ہے۔۔۔۔۔ (۱۴)

الغرض قدرت نے اپنے ''مقدس گھر'' اور مولد نبوی ﷺ کے لیے جس مقام اور جس خطے کا انتخاب کیا' وہ ہر اعتبار سے ہی ''کائنات ارضی'' کا قلب و مرکز قرار پانے کے مستحق ہے' پھر دنیا کے نقشے پر ایک نظر ڈالنے سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ایشیا' یورپ اور افریقہ کے براعظموں میں جزیرہ نمائے عرب کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ یہ ایشیا میں ہوتے ہوئے بھی براعظم افریقہ اور یورپ سے بہت قریب واقع ہے.

پھر یہ مقام ایسا ہے کہ دنیا کے ہر مقام سے اس تک پہنچنا اور اس کے جلووں سے خود کو فیض یاب کرنا بہت آسان ہے' چنانچہ قدیم زمانے میں بحری جہازوں کے اور جدید دور میں دنیا کی بڑی بڑی ائیر لائنوں کے روٹ اس کے قریب سے گزرتے ہیں' اسی لیے وہاں آنے اور اس کی جلوہ گاہوں تک رسائی حاصل کرنے میں دنیا کے کسی خطے کے لوگوں نہ تو وقت پیش آتی ہے اور نہ ہی دشواری.

پھر ایک اور حکمت بھی اس انتخاب میں پیش نظر رہی ہے' جس کا اندازہ وہاں بار بار حاضری کے بعد ہوتا ہے' وہ یہ کہ اس خطے میں گرمی تو خوب پڑتی ہے' مگر یہاں موسم سرما بہت ہی معتدل ہوتا ہے۔ چنانچہ جن ایام میں ایشیا کے شمالی حصوں میں کڑا کے سردی پڑتی ہے' ان ایام میں بھی یہاں پنکھے' بلکہ ائیر کنڈیشنر چل رہے ہوتے ہیں اور جب زمین کے جنوبی حصوں میں موسم سرما کا دورہ ہوتا ہے تب بھی اس سرزمین پر گرمی ہی ہوتی ہے' اس کی حکمت غالباً یہ ہے کہ یہاں ہر موسم میں زائرین اور عمرہ کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے اور اگر موسم گرما کی طرح موسم سرما بھی اپنے جاہ وجلال کے ساتھ یہاں نمودار ہو جایا کرتا' تو لوگوں کو احرام پہننے اور حج وعمرہ ادا کرنے میں بے حد دقت اور دشواری پیش آتی۔

(۷) تعمیر خانہ خداوندی:

بعض روایات میں ہے کہ بیت اللہ شریف کی اولین تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے فرمائی تھی۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام نے اسے تعمیر کیا۔

بہرحال سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے باب فضائل کا سب سے روشن اور زریں ورق یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت دنیا میں اللہ تعالیٰ کے پہلے بابرکت اور مقدس گھر کی تعمیر فرمائی...... قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۱۶)	اور (یاد کیجئے) جب ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام اللہ کے گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (اور کہہ رہے تھے): پروردگار ہماری طرف سے (اسے قبول فرما' کچھ شک نہیں' تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ ...... (۱۷)	اور (یاد کیجئے) جب ہم نے ابراہیم کو بیت اللہ کی جگہ سمجھائی۔

ان آیات مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس متبرک اور مقدس گھر کی جگہ بتلائی تھی اور اس کی تعمیر آبادی کا حکم دیا تھا' اس واقعے کی تفصیل احادیث میں بیان کی گئی ہے چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''پھر ابراہیم علیہ السلام کو وہاں آنے کا خیال ہوا' تو انہوں نے اپنے گھر والوں سے کہا: میں اپنی اولاد کا پتہ لینے جاتا ہوں' چنانچہ وہ (مکہ مکرمہ) آئے۔ تو انہوں نے (حضرت) اسماعیل علیہ السلام کو زمزم کے پیچھے تیروں کو درست کرتے ہوئے پایا' انہوں نے کہا: اے

اسماعیل علیہ السلام تیرے پروردگار نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس کا گھر بناؤں' انہوں نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پروردگار کی بات ضرور مانیے' فرمایا: یہ بھی کہا ہے کہ اس سلسلے میں تم میری مدد کرو گے' کہا میں ضرور کروں گا...... یا جیسے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا...... نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا: کہ پھر وہ دونوں اٹھے۔ اب ابراہیم علیہ السلام خانۂ خدا کی تعمیر کر رہے تھے' اور اسماعیل علیہ السلام انہیں پتھر لا لا کر پکڑا رہے تھے اور وہ دونوں یہ کہتے جاتے تھے' پروردگار ہماری طرف سے (اسے) قبول فرما' بے شک تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے" (۱۸)

ایک اور حدیث میں اس واقعے کی مزید تفصیل بھی ملتی ہے' ارشاد ہے:

"پھر...... ابراہیم علیہ السلام ان کے پاس آئے' اس وقت اسماعیل علیہ السلام زمزم کیقریب کھڑے تھے، پھر انہوں نے وہی کچھ کیا' جو ایک باپ اپنے بیٹے سے اور بیٹا اپنے باپ سے (مصافحۂ و معانقہ وغیرہ) کرتا ہے۔ پھر وہ بولے: اسماعیل! اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک خاص حکم دیا ہے کہا: آپ اپنے پروردگار کے حکم کی ضرور تعمیل کیجئے' فرمایا: کیا تو اس کام میں میری مدد کرے گا: کہا: ضرور کروں گا' فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے' کہ میں اس جگہ ایک گھر بناؤں' انہوں نے قریب ہی موجود ایک بلند ٹیلے کی طرف اشارہ کیا' فرمایا: (اس جگہ) اس کے بعد' انہوں نے اللہ تعالیٰ کے گھر کی تعمیر کی: اسماعیل پتھر لاتے رہے اور ابراہیم علیہ السلام' تعمیر کرتے رہے' پھر جب اس کی دیواریں اونچی ہو گئیں' تو وہ اس پتھر (مقام ابراہیم) کو لائے اور اسے نیچے رکھ لیا اور وہ اس پر کھڑے ہو گئے اور بیت اللہ کی تعمیر جاری رکھی اور اسماعیل علیہ السلام پتھر لا لا کر پکڑاتے (اور یہ

کہتے جاتے): پروردگار ہماری طرف سے اسے قبول فرما، تو ہی سننے والا
جاننے والا ہے، فرمایا: انہوں نے اس کی تعمیر جاری رکھی اور جب وہ
بیت اللہ شرف کا ایک چکر لگا لیتے تو پھر فرماتے: پروردگار ہماری طرف
سے اسے قبول فرما، تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے......"(۱۹)

حافظ ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ نے الفا کہی کے حوالے سے حدیث "ابی جہم" روایت کی ہے، جس میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب بیت اللہ شریف کی تعمیر کی اس وقت ان کی عمر ۱۰۰ برس اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر ۳۰ برس تھی...... (۲۰)

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بیت اللہ شریف کی یہ تعمیر بے سروسامانی کے عالم میں کی تھی، جیسا کہ حافظ ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ نے عثمان اور ابوجہم کی روایات کے حوالے سے لکھا ہے:

"انہوں نے اس کی بلندی ۹ ہاتھ اور چوڑائی چالیس ہاتھ رکھی......
انہوں نے یہ عمارت پتھروں پر پتھر رکھ کر بنائی تھی۔ اس کی چھت
نہیں تھی، اس کا ایک دروازہ تھا، دروازے کے پاس ایک کنواں
(گڑھا) تھا، جو بیت اللہ شریف کا سٹور تھا، جس میں وہ اشیا ڈال
دی جاتیں جو بیت اللہ شریف کو نذر کی جاتی تھیں"...... (۲۱)

علامہ الازرقی نے انہی ابوجہم رحمہ اللہ کے حوالے سے مزید لکھا ہے:

"حضرت اسماعیل علیہ السلام میدان میں پتھر تلاش کرنے لگے، تو حضرت
جبرئیل علیہ السلام حجر اسود لے کر نازل ہوئے اور اسے اس وقت، جب
(حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں) زمین تہہ آب آئی تھی،
آسمانوں پر اٹھا لیا گیا تھا، جب حضرت اسماعیل علیہ السلام واپس آئے اور
یہ پتھر دیکھا تو پوچھا: آپ ﷺ کے پاس یہ پتھر کون لایا ہے! کہا:
وہ ذات، جس نے مجھے تیرے اور تیرے پتھروں کے حوالے نہیں
کیا" (۲۲)

الغرض اس ''خانۂ خدا'' کی تعمیر کرنے والوں کے پاس گو عمارتی ساز و سامان کی کمی تھی' ان کے پاس ظاہری ''کروفر'' نہ تھا' اونچی اونچی کرینیں اور سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں مزدور نہ تھے' لیکن ایک دولت کی ان کے پاس بہت وافر مقدار میں تھی...... یعنی اخلاص اور محبت خداوندی والی دولت اور رضاے الٰہی کے جذبے اور اخلاص والی قوت اور دنیا نے دیکھا کہ وہ عمارتیں اور وہ گھر جسے بنانے والوں نے اپنے اخلاص کے مسالے اور اپنے جذبوں کے پتھروں سے تعمیر کیا تھا وہ بے چھت کا مکان آج دنیا کے سارے مکانوں سے زیادہ آباد اور زیادہ بارونق ہے......

علامہ الازرقی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض روایات کی مدد سے اس کی پیمائش حسب ذیل بیان کی ہی ہیں:

مشرقی جانب	حجر اسود سے رکن عراقی تک	۳۲ ہاتھ (۴۸ فٹ یا ۱۴٫۳۳ میٹر)
شمالی جانب	رکن عراقی سے رکن شامی تک	۲۲ ہاتھ (۳۳ فٹ یا ۱۰ میٹر)
مغربی جانب	رکن شامی سے رکن یمانی تک	۳۱ ہاتھ (۴۶ ۱/۲ فٹ یا ۱۳٫۵۸ میٹر)
جنوبی جانب	رکن یمانی سے حجر اسود تک	۲۰ ہاتھ (۳۰ فٹ یا ۱۹٫۱۵ میٹر)

دیواروں کی بلندی ۹ ہاتھ ۱/۲ ۱۳ فٹ ۱۰٫ ۶ میٹر) اور چوڑائی ۲ ہاتھ (۳ فٹ ۹ انچ) تھی۔ (۲۳)

تعمیر ابراہیم واسماعیل کی خصوصیات:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ کے اس مقدس اور متبرک گھر کی پہلی مرتبہ تعمیر فرمائی' تو روایات کی رو سے' اس کی حسب ذیل خصوصیات تھیں:

(ا) بیت اللہ شریف کی مستطیل شکل:

اس تعمیر میں بیت اللہ شریف کی مستطیل شکل تھی اور دروازہ تھا' جس کے کواڑ تھے اور نہ ہی اس کو بلند کیا جا سکتا تھا۔

(ب) کعبۂ معلیٰ کی چھت نہیں تھی:

دروازہ کے سامنے دائیں جانب ۶ء۴ فٹ (۳۷ا میٹر) گہرا گڑھا تھا۔[۲۴] یہ تعمیر ایک اونچے ٹیلے پر کی گئی تھی' مگر مرور ایام سے آس پاس کے پہاڑوں کی مٹی بہہ بہہ کر آتی تھی اور یہ ٹیلہ...... زمین کے برابر' بلکہ نشیب میں چلا گیا...... ابتداءً باب ابراہیم کی جانب حرم شریف میں داخل ہونے کے لیے پندرہ سیڑھیاں چڑھ کر دروازے تک پہنچا جاتا .. علامہ طاہر کردی کے زمانے (۱۲۰۰ھ/۱۸۸۲ء) میں چھ سیڑھیاں مٹی میں دب چکی تھیں، مگر سات باقی تھیں'...... شعبان ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۶ء میں جب باب الزیاد کے سامنے فرش بنایا گیا تو پانچ سیڑھیاں اور دب گئیں اور صرف دو سیڑھیاں باقی رہ گئیں...... پندرھویں صدی ہجری میں ابتدائی دہائی میں سعودی عرب کی حکومت نے جب باہر سڑکوں کی تعمیر کی' تو اب باہر کی زمین...... ''حرم'' سے اونچی ہوگئی ہے اور متفرق جگہوں سے ۲۷ سیڑھیاں اتر کر حرام کعبہ میں داخل ہوا جاتا ہے......[۲۵]

حوالہ جات وحواشی

(۱) آل عمران' ۳/ ۹۶.

(۲) ان تمام اقوال کے لیے دیکھیے' لسان العرب' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت' ۱۶۲/۱۳.

(۳) بطلیموس (Ptolemee) (۹۰-۱۶۸ء) ایک مشہور یونانی ماہر علم الافلاک اور ماہر جغرافیہ نگار تھا' اس نے اسکندریہ میں پرورش پائی' اس کی تصانیف میں المجسطی اور جغرافیا خصوصاً قابل ذکر ہیں' اس نے سب سے پہلے یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین ساکن ہے اور فلک اس کے گرد گھوم رہا ہے (الاعلام)

(۴) سید سلیمان ندوی، ارض القرآن' ص ۲/ ۲۸۷.

(۵) تکوین' ۳۲/ ۲۷-۲۸.

(۶) ایضاً

(۷) دیکھیے: مقالہ (Hero as Prophet)

(۸) زبور: ۸۴/ ۱-۷.

(۹) کتاب الھدیٰ' ص ۴۱-۴۷.

(۱۰) سیرۃ النبی' ۱/ ۱۵۳-۱۵۴' مطبوعہ اعظم گڑھ.

(۱۱) سیرۃ النبی' ۱/ ۱۵۳' مطبوعہ اعظم گڑھ.

(۱۲) دائرۃ المعارف' ۹/ ۳۲۶.

(۱۳) تاریخ القویم' ۱/ ۲۹؛ ارض القرآن' ص ۲۸۷.

(۱۴) قاضی سلیمان سلمان منصور پوری' رحمۃ للعالمین' ۱/ ۳۰.

(۱۵) راقم الحروف کو خود اس کا عملی تجربہ ہو چکا ہے' نومبر' دسمبر ۲۰۰۳ء میں، جبکہ لاہور کا درجہ حرارت ۴ سے ۵ ڈگری سینٹی گریڈ تھا اور یہاں لحاف کے بغیر لیٹنا ممکن نہ تھا' جدہ اور مکہ مکرمہ کا درجہ حرارت ۲۴ تا ۳۰ سینٹی گریڈ تھا اور لوگوں کو احرام پہننے میں قطعاً دقت پیش نہیں آتی تھی۔ تاہم ذوالحجہ ۱۴۲۶ھ/ دسمبر ۲۰۰۶ء کے موسم حج کا تجربہ بالکل مختلف تھا۔ اس سال موسم حج میں اتنی سردی پڑی کہ حجاج کے لیے اسے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ اور بہت سے لوگ بیمار پڑ گئے۔ تاہم ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔

(۱۶) البقرہ (۲/ ۱۲۷).

(۱۷) الحج' ۲۲/ ۲۶.

(۱۸) البخاری' مع فتح الباری' ۶/ ۳۹۹' باب ۹' حدیث ۳۳۶.

(۱۹) البخاری' ۶/ ۲۹۷' کتاب الانبیاء' باب ۹' ۸' حدیث ۲۴۶۴.

(۲۰) فتح الباری' ۶/ ۴۰۵.

(۲۱) فتح الباری' ۶/ ۴۰۶.

(۲۲) الازرقی' اخبار مکہ : ص ۳۱.

(۲۳) تاریخ القویم' ۳/ ۵.

(۲۴) ایضاً۔ ۳/ ۴۹۔ ۵۰.

(۲۵) البخاری' ۶/ ۳۹۷ (کتاب الانبیا' باب ۹' حدیث ۳۳۶۴.

بسم الله الرحمن الرحيم

قال الله تعالى في القرآن العزيز الحكيم

ما كان محمد ابا احد من رجالكم ولكن

رسول الله وخاتم النبيين

(الاحزاب)

قال النبي صلى الله عليه وسلم

انا خاتم النبيين لا نبي بعدي

باب 5

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کا دور

''ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی سے دوسرا آزاد عورت سے، پر وہ جو لونڈی سے تھا جسم کے طور پر پیدا ہوا اور جو آزاد تھا، سودے کے طور پر، یہ بات تمثیلی بھی مانی جاتی ہے''اس لیے کہ یہ عورتیں دو عہد ہیں''ایک تو سینا کے پہاڑ سے جو ہوا، وہ نرے غلام جنتی ہے، یہ ہاجرہ ہے، کیونکہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یروشلم کا جواب ہے''(۱)

اللہ تعالیٰ نے جب اپنے گھر کی'' آباد کاری'' کا فیصلہ کیا، تو اس نے سارے عالم پر نظر ڈالی اور اس کی نظر روئے زمین اور عالم ارواح سے ہوتی ہوئی سرزمین بابل و نینوا میں تارخ (یا آذر) کے گھر پر آ کر ٹھہر گئی اور اس خاندان کے سپوت کا انتخاب کیا، جن کا نام نامی حضرت ابراہیم علیہ السلام تھا.

حضرت ابراہیم علیہ السلام اگر اپنے گھر اور اپنے علاقے میں مقیم رہتے تو ان کے ذریعے''مکہ مکرمہ''میں انسانی تاریخ کا یہ نیا باب کیسے رقم ہو پاتا؟......اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ ان کے لیے سرزمین بابل میں قیام کرنا ممکن نہ رہا.

پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ترک وطن کر کے''ارض کنعان''میں پہنچے، جو سرزمین عرب کا شمالی کنارہ ہے، تو اللہ تعالیٰ نے وہاں قحط سالی کے آثار پیدا کر دیئے، جس کے نتیجے میں ابراہیم علیہ السلام کو تہذیب و تمدن کے دوسرے بڑے مرکز''مصر''پہنچنا پڑا اور وہاں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ بادشاہ وقت انہیں اپنی لخت جگر کا رشتہ دینے

پر مجبور ہو گیا۔

اس طرح ایک ''نئی نسل انسانی'' کے لیے، دنیا کے دو تہذیبی مراکز سے جب دو موزوں اور باصلاحیت افراد مل گئے تو اللہ تعالیٰ نے ۸۶ برس کی عمر میں ابراہیم علیہ السلام کو اس عظیم بیٹے کا باپ بنا دیا، جس کی آرزو انہیں ہر وقت بے چین اور مضطرب رکھتی تھی۔

پھر چونکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ومشیت کا تقاضا یہ تھا کہ یہ نئی نسل اسی علاقے میں پرورش پائے جہاں اسے نئی تاریخ رقم کرنا اور اللہ کے گھر کی تعمیر وتکمیل کے بعد اسے اپنے سجدوں سے سجانا اور اس کے ماحول کو ہر آلودگی سے پاک وصاف رکھنا تھا، لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے اکلوتے لخت جگر کو شیر خوارگی کے عالم میں ''ارض مکہ'' میں پہنچانے کا حکم دیا گیا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ہوش کی آنکھیں اسی وادی میں آ کر کھولیں، جسے قرآن حکیم نے ظاہری اعتبار سے ''وادی ذی زرع'' قرار دیا ہے، مگر جو روحانی اعتبار سے، دنیا کی سب سے بڑی ''کشت گاہ'' بننے والی تھی، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اسی علاقے میں آ کر بولنا سیکھا اور اسی زمین پر...... چلنے کی تربیت پائی...... اور بالغ ہونے پر اسی علاقے میں انہوں نے شادیاں کیں۔ اور اولاد پیدا کی یہ سب کچھ مشیت ایزدی کے تحت انجام پایا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ذات اس قصے میں مرکزی اہمیت کی حامل ہے۔ انہی کی ذات ظاہری طور پر اس علاقے کی آبادکاری کا ذریعہ بنی۔ احادیث میں ان کی دو شادیوں کا تذکرہ ملتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

''اور وہ لڑکا جوان ہو گیا اور اس نے ان سے زبان سیکھ لی، اور جب وہ جوان ہوا تو وہ ان سب لوگوں میں سب سے عمدہ اور خوب صورت نوجوان بن کر سامنے آیا۔ جب وہ بڑا ہو تو حضرت ہاجرہ نے ان کی شادی ان (بنو جرھم) میں سے ایک عورت سے کر دی۔ اسی دوران میں ان کی والدہ فوت ہو گئیں۔ ایک دن ایسا ہوا، کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی

شادی کے بعد، حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں آئے، تاکہ وہ چھوڑے ہوئے ورثہ کو دیکھیں، مگر انہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام نہ ملے۔ آپ نے ان کی بیوی سے ان کے بارے میں پوچھا، تو اس نے بتایا کہ وہ ہمارے کھانے کے لیے کچھ تلاش کرنے گئے ہیں، آپ نے ان کی حالت اور معیشت کے بارے میں دریافت کیا، تو وہ بولی ہم بری حالت اور سخت تنگی میں ہیں، اس نے اپنے معاشی حالات کا ان کے سامنے شکوہ کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: کہ جب تمہارا خاوند آئے تو اسے میرا سلام دینا اور کہنا کہ وہ اپنے گھر کی دہلیز کو بدل دے۔ جب اسماعیل علیہ السلام واپس آئے، تو انہوں نے گویا کچھ محسوس کر لیا، لہٰذا انہوں نے پوچھا: کیا کوئی شخص آیا تھا، وہ بولی ہاں ایک اس طرح کی حالت والا بڑی عمر کا شخص آیا تھا، اس نے آپ کے متعلق پوچھا اور مجھ سے استفسار کیا کہ ہمارا گزر کیسے ہو رہا ہے؟ تو میں نے انہیں بتایا کہ ہمارا گزارہ سخت مشقت اور محنت کے ساتھ ہو رہا ہے؛ پوچھا کیا وہ بزرگ تجھے کچھ کہہ گئے ہیں، کہا ہاں، مجھے انہوں نے کہا میں تمہیں سلام کہوں اور یہ پیغام دوں کہ آپ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل لیں۔ انہوں نے کہا: وہ میرے والد تھے اور انہوں نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں تجھے طلاق دے دوں۔ تو اپنے گھر والوں کے پاس چلی جا، چنانچہ انہوں نے اسے طلاق دے دی اور پھر انہوں نے دوسری عورت سے نکاح کر لیا۔''

''بعد ازاں حضرت ابراہیم علیہ السلام جتنی دیر اللہ نے چاہا، اپنے علاقے میں مقیم رہے، پھر وہ ان کے پاس آئے، تو وہ حسب سابق انہیں نہ ملے، وہ ان کی بیوی کے پاس آئے اور اس سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے کہا وہ ہمارے کھانے کے لیے کچھ تلاش کرنے گئے ہیں، آپ نے پوچھا ''تمہارے گھریلو حالات کیسے ہیں؟ وہ بولی ہم بہت بھلائی اور فراخی کی حالت میں ہیں، اور اس نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی؛ پوچھا: تمہارا کھانا کیا ہے، کہا: گوشت، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: تمہارا مشروب کیا ہے؟ وہ بولی پانی، حضرت ابراہیم بولے، اے اللہ (ان کے لیے) گوشت اور پانی میں برکت ڈال دے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان دنوں غلہ نہیں ہوتا تھا اور وہ ان کے پاس ہوتا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور ان کے لیے، اس میں برکت کی دعا کرتے، فرمایا: اگر کوئی شخص مکہ مکرمہ کے علاوہ صرف یہی دو اشیاء کھائے تو وہ اس کے لیے کبھی موافق نہ ہوں گی، البتہ

اس سرزمین پر یہ دونوں چیزیں بے حد موافق ہیں، کہا: جب تیرا خاوند آئے تو اسے میرا سلام دینا اور کہنا کہ وہ اپنے گھر کی چوکھٹ برقرار رکھے۔ جب (حضرت) اسماعیل علیہ السلام گھر آئے تھے، تو پوچھا، کیا کوئی شخص آیا تھا۔ وہ بولی ہاں، ایک عمدہ حالت وھیئت والے بزرگ آئے تھے، اس نے ان کی تعریف کی اور بتایا کہ اس نے ہماری حالت کے متعلق پوچھا، تو میں نے بتادیا کہ ہم وسعت وفراخی میں ہیں۔ پوچھا کیا انہوں نے کوئی حکم دیا تھا، وہ بولی، ہاں انہوں نے آپ کو سلام دیا تھا اور کہا تھا کہ آپ دروازے کی چوکھٹ کو برقرار رکھیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کہا: وہ میرے والد محترم تھے اور انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تجھے اپنے گھر میں (بطور بیوی) برقرار رکھوں'' (۲)

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے ''حدیث نبوی'' کی اس عبارت اور توریت کے الفاظ میں ایک واضح اختلاف نظر آتا ہے، حدیث نبوی کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دونوں بیویاں مقامی، یعنی بنو جرہم سے تعلق رکھتی تھیں، جبکہ ''توریت'' کی رو سے ان کی بیوی مصر کی رہنے والی تھی:

''اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا اور اس کی ماں نے ملک مصر سے اس کے لیے بیوی لی...... (۳)

اور چونکہ تمام حقائق اس بات کے حق میں ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ہاجرہ نے اپنی تمام عمر مکہ مکرمہ میں بسر فرمائی اور مذکورہ بالا عبارت میں بھی ''فاران کے بیابان'' سے یہی علاقہ مراد ہے، ان حالات میں کسی ''مصری بیوی'' کا لانا ممکن نہیں ہے...... اس لیے یہ بات بھی توریت کا ایک تاریخی جھوٹ ہے۔

(2) حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد:

قرآن کریم اور کتب سابقہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں برکت کا جو وعدہ فرمایا تھا اور ''حضرت اسماعیل'' کی اولاد کو ایک بڑی قوم بنانے کا جو یقین دلایا تھا وہ حرف بحرف پورا ہوا...... چنانچہ ان کا ہاں حسب ذیل بارہ لڑکے پیدا ہوئے: جن میں سے

ہر ایک لڑکا، اپنے اپنے خاندان کا سردار بنا:

① نبایوط (نابت) ② قیدار ③ اوبائیل ④ مبشام
⑤ مشماع ⑥ دوما ⑦ ھشا ⑧ حدر
⑨ تیما ⑩ یطور ⑪ نفیس اور ⑫ قیدما (۴)

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے باقی حالات معلوم نہیں ہیں، توریت میں صرف یہ صراحت ہے:

''یہ اسماعیل کے بیٹے ہیں اور انہی ناموں سے ان کی بستیاں اور چھاؤنیاں نامزد ہوئیں اور یہی بارہ بیٹے اپنے اپنے قبیلہ کے سردار ہوئے ...... (۵)

توریت میں حضرت اسماعیل کی بیویوں کے نام محفوظ نہیں، جبکہ احادیث میں دو بیویوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، مسلم مؤرخین نے ان میں سے، دوسری بیوی کا نام رعلہ بنت مضاض بن عمرو الجرہمی یا رعلہ بنت یعرب لکھا ہے۔ (۶)

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سب سے بڑے بیٹے نبایوط (نابت) اور سب سے چھوٹے قیدار تھے...... عجیب بات یہ ہے کہ عرب کی قدیم تاریخ میں یہی دونوں نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تمام بھائی اپنے زمانے میں اور ان کے بعد عرصے تک حجاز ہی میں آباد رہے اور چچا زاد بھائی کے بیٹوں یعنی فرزندان مدین کے ساتھ مل کر یمن و حجاز سے شام و مصر تک تجارتی قافلوں کے ساتھ سفر کرتے اور دوسرے عرب تاجروں کی طرح خوشبودار ساز و سامان کی تجارت کرتے تھے۔

اس وقت خوشبو کی تجارت مصر سے شام کو ہوتی تھی، شام اور یمن کے عین درمیان میں مکہ معظمہ واقع تھا۔ اس لیے...... حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد نے بہت جلد تجارت میں فروغ حاصل کر لیا ہوگا۔ (۷)

اولاد اسماعیل کا ذکر تورات میں سب سے پہلے ...... حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانہ میں تجارت کی مناسبت سے آیا ہے...... حضرت یوسف کے بھائیوں نے جب حضرت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں پھینکا تو اتفاقاً وہاں سے ایک تجارتی قافلے کا گزر ہوا۔ جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں سے نکالا اور انہیں مصر میں ''عزیز مصر''

کے پاس لا کر فروخت کر دیا...... یہ قافلہ انہی اسماعیل اور مدیانی لوگوں کا تھا(۸)۔تاریخ عالم میں یہ سب سے قدیم قافلہ تجارت ہے، جس کا ذکر محفوظ ہے.

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں (تقریباً ۱۵۰۰ ق م) میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تمام حجاز میں یمن (حویلہ) سے شام (شور) تک پھیل گئی...... (۹)......قضاۃ کے دور (نواح: ۱۳۰۰ ق م) میں وہ عمالیق اور اہل مدین کے ساتھ مل کر...... بنی اسرائیل پر حملے کرتے اور چھاپے مارتے نظر آتے ہیں...... سات برس تک مسلسل اسرائیلی بنو اسماعیل کی زد میں رہے۔ ہر سال جو فصل تیار ہوتی، بنو اسماعیل کے لوگ آتے اور لوٹ مار کر چلتے بنتے، آٹھویں برس جدعون نامی پہلوان نے انہیں شکست دی.(۱۰)

اس دور میں بنو اسماعیل کے لوگ نہایت مال دار تھے، چنانچہ اس جنگ سے جو مال غنیمت ان کے ہاتھ لگا اس کا وزن سترہ سو مثقال تھا.(۱۱)

(3) اولاد اسماعیل کے دور میں بیت اللہ شریف کا انتظام وانصرام:

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنی وفات (۱۹۳۷ ق م) تک ''بیت اللہ'' شریف کے متولی اور منتظم رہے، ان کی وفات ۱۳۷ برس کی عمر میں ہوئی، اس وقت ان کی اولاد بھی بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھ چکی ہو گی، چنانچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وفات کے بعد بیت اللہ شریف کے انتظام وانصرام کی ذمہ داری حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پہلوٹھی اولاد، حضرت بنایوت (نابت) تک پہنچی...... چنانچہ وہ اپنے ماموں یعنی بنو جرہم کی مدد سے بخوبی ''بیت اللہ'' شریف کا نظم ونسق چلاتے رہے۔ تاریخ مکہ میں بلا کسی حوالہ کے لکھا گیا ہے:

''وہ (نابت رضی اللہ عنہ) بڑے جلیل القدر انسان تھے، چونکہ ان کے اجداد (سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام) بابل کے شہر ''اُر'' کے باشندے تھے اور ننھیال سیدہ ہاجرہ مصری تھیں، اس سبب سے ان دونوں عظیم مملکوں کے تجارتی قافلے مکہ مکرمہ میں قیام کر کے گزرتے تھے، جس کے سبب یہ شہر عالمی شہرت کا سبب بن گیا''.(۱۲)

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دوسرے صاحبزادے "قیدار" بھی نہایت عقل مند اور سمجھ دار بزرگ تھے...... ان کی اولاد مکہ مکرمہ میں آباد ہوئی...... وہ اپنے بھائی حضرت "نابت" کے دست بازو بنے رہے، اس کے علاوہ ان کے کسی اور کردار کا ماخذ میں کوئی ذکر نہیں ملتا"۔

معروف روایت کی رو سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب مبارک انہی قیدار کی توسط سے، حضرت اسماعیل علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔

(4) اسماعیلیوں کی بین الاقوامی تجارت:

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد چند ہی سالوں میں اسماعیلیوں نے بین الاقوامی تجارت میں اتنا نام پیدا کر لیا کہ تورات میں نہ صرف یہ کہ جگہ جگہ ان کا ذکر ملتا ہے، بلکہ تورات نے اکثر دونوں کو ایک ہی سمجھا ہے (۱۳) مثلاً ایک جگہ یہ صراحت ہے۔

"انہوں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ اسمٰعیلیوں کا ایک قافلہ جلعاد (شام) میں ایک پہاڑ کی طرف سے آیا جو اونٹوں پر بخورات، بلسان اور مسالہ لاد کر مصر کو لے جا رہا تھا...... اتنے میں مدیانی تاجروں کا ایک قافلہ گزرا، جنہوں نے یوسف کو کنوئیں سے نکال لیا، اور اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچ ڈالا...... یہ اسماعیلی یوسف کو مصر لائے...... مدیانیوں نے یوسف کو مصر میں فروخت کیا...... ایک مصری امیر نے یوسف کو اسمٰعیلیوں کے ہاتھ سے جو یوسف کو مصر لائے تھے، لے لیا"۔ (۱۴)

اس عبارت میں اسمٰعیلی اور مدیانی ناموں میں جو اختلاط اور تشابہ ہے، بقول مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کیا اس کا حل بغیر اس کے کچھ اور ہو سکتا ہے کہ قافلہ کو نسلاً اسماعیلی اور وطناً مدیانی حجازی فرض کیا جائے۔ یہ واقعہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے کے زمانہ کا ہے، اس بنا پر یہ اسماعیلی کارواں بھی حضرت اسماعیل کے بیٹے اور پوتے ہوں گے، جن کو ابھی تک باپ کے مسکن کے چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ اس واقعہ کے پانچ سو برس کے بعد کے زمانے میں بھی یہی اختلاط دکھائی

دیتا ہے...... حضرت موسیٰ علیہ السلام خود مدت تک مدین میں رہے، جو انہی اسماعیلیوں کا مسکن تھا۔

دونوں اقوام کے مابین صدیوں تک باہمی تعلقات کا حوالہ ملتا ہے۔ چنانچہ جب بنو اسماعیل نے اپنے چچا زاد بھائیوں بنو اسرائیل سے شکست کھائی اور بنی اسرائیل کو بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ آیا، تو بنی اسرائیل کا سردار جدعون کہتا ہے:

''میں تمہارے مالِ غنیمت میں صرف یہ سونے کے بالے مانگتا ہوں، کیونکہ یہ لوگ (مدیانی) اسماعیلی ہیں''۔(۱۵)

الغرض یہ تمام بھائی باپ کے زمانہ میں اور ان کے بعد بھی ایک عرصہ تک حجاز ہی میں آباد رہے اور چچا زاد بھائی کے بیٹوں، یعنی فرزندانِ مدین کے ساتھ مل کر یمن و حجاز سے شام و مصر تک تجارتی قافلوں کے ساتھ سفر کرتے رہے اور دیگر عرب تاجروں کی طرح خوشبودار چیزوں کی تجارت میں خوب نام کماتے رہے۔ (۱۶)

خوشبودار اشیاء یمن سے حجاز کی راہ سے مصر اور شام کو جاتی تھیں، شام اور یمن کے بیچ میں درمیانی منزل شہر مکہ تھا، اس لیے بنو اسمٰعیل نے بہت جلد تجارت میں نام پیدا کر لیا۔ (۱۷)

اس زمانے میں بنی اسماعیل کا شمار نہایت دولت مند قوموں میں ہوتا تھا۔ کانوں میں مرد سونے کے زیور پہنتے تھے، اونٹوں کے گلے میں سونے کے قلاوے ڈالتے تھے۔

حضرت طالوت کے عہد میں (۱۰۵۰ق م) میں جو بنی اسرائیل کی تاریخ میں قضاۃ یا طوائف الملوکی کا دور کہلاتا ہے۔ بنو اسماعیل حجاز سے نکل کر شام اور عراق تک پھیل گئے۔

عموماً اس کی تائید قدیم یہودی روایات سے بھی ہوتی ہے، تورات کی رو سے اسی زمانہ میں بنی اسرائیل کا ایک گروہ بھی نہر فرات کے قریب عراق میں آ کر آباد ہو گیا تھا، ان کا بنو ہاجرہ سے سامنا ہو گیا بنو اسرائیل نے لڑ کر بنو ہاجرہ کو نکال دیا اور ان کے خیموں میں جا کر خود آباد ہو گئے۔ (۱۸)

اس واقعہ کے چالیس برس کے بعد بنواسمٰعیل، شمالی عرب و حدود شام کے قبائل سے متحد ہو کر حضرت داؤد کے عہد میں (غالباً ۱۰۰۰ ق م) میں بنی اسرائیل پر حملہ کی تیاریاں اور مشورے کر رہے تھے (۷۰۰ ق م) میں جلعاد اور دیگر حدود شام میں جنگ آزمودہ اسرائیلی، دوبارہ بنو ہاجرہ سے برسر پیکار ہوئے اور ان کو شکست دی اور بہت سا مالِ غنیمت ان کے ہاتھ آیا۔

اس کے بعد (۶۰۰ ق م) میں وہ زمانہ آتا ہے جب بنوکدنضر (بخت نصر) آندھی کی طرح شام سے اٹھا، اور تمام شام وعرب کی خاک اڑا دی۔

"اور پھر ہمیشہ کے لیے بنو اسرائیل اور آلِ اسماعیل کے مخاصمانہ
حوصلہ مندیوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔"

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دوسرے صاحب زادوں کے متعلق جو کچھ معلوم ہے۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۳۔ مبشام:

اس خاندان کے متعلق ہم کو کچھ معلوم نہیں۔

۴۔ عرب مؤرخین کو اس کے متعلق کوئی واقفیت نہیں ہے۔ تورات میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ فارسٹر کا بیان ہے کہ یہودی مؤرخ یوسیفورس نے لکھا ہے کہ "میتقین اسماعیلی آبادیاں (یعنی نیل وفرات) کے درمیان یہ خاندان آباد تھا۔"(۱۹)

۵۔ عرب مؤرخین نے بنومسما نام کے ایک خاندان کا نجد میں سکونت پذیر ہونا بیان کیا ہے، یوسیفورس نے مسماؤس اور بطلیموس نے مسی مانیس کے نام سے ان ہی اطراف میں ایک عرب قبیلہ کا ذکر کیا ہے۔

۶۔ مشا:

یونانی اور عرب جغرافیہ دانوں کی شہادت کی بنا پر حدود عراق میں اس خاندان کے آثار نظر آتے ہیں، پلینی نے میا (Misaie) اور بطلیموس نے مسانی (Masani) کے نام سے ان اطراف میں بعض قبائل کا ذکر کیا ہے۔

یاقوت حموی واسط و بصرہ کے مابین، یسان نام کے ایک شہر کا ذکر کرتا ہے یہودی اس شہر کا بے حد احترام کرتے ہیں اور حضرت عزیر کا مدفن قرار دیتے ہیں، عہدِ اسلام میں بھی زیادہ تر یہاں یہودیوں کی آبادی تھی۔ سفرالایام نے جن بنو ہاجرہ کا بادیۂ عراق میں ذکر کیا گیا ہے (۲۰) شاید وہ یہی خاندان ہو.

۷۔ یطور:

ساؤل کے زمانہ میں (۱۰۵۰ق م) حدود شام کے صوبۂ حوران میں نظر آتے ہیں، بنی اسرائیل کی ایک جماعت سے برسر پیکار ہوتے ہیں اور شکست کھاتے ہیں (۲۱)، لیکن یونانی جغرافیہ نویس اسٹرابو (۲۴ق م) تک ان کی آبادی قائم رہتی ہے، وہ لکھتا ہے:

> ''وہ تمام سلسلۂ کوہ جو لبنان اور بصریٰ کے درمیان نظر آتا ہے
> عربوں سے ایطوریوں سے آباد تھا.''(۲۱)

یونانی میں یطور جطور ہو گیا ہے، اس بنا پر کھارڈ ایک یورپین سیاح کے جدود شہر کو اسی جطور سے نسبت دیتا ہے یہ شہر جغرافیہ نویسوں سے بھی مخفی نہیں، لیکن اگر جدور ہی کو یطور کا مسکن قرار دیا جائے تو یہی نام ہم کو حجاز میں مدینہ سے چھ میل کی مسافت پر نظر آتا ہے. (۲۲)

۸۔ سفر ایام ثانی (۵-۱۲) سے ثابت ہوتا ہے کہ یطور کے ساتھ یہ خاندان بھی حوران ہی میں آباد تھا اور بنی اسرائیل کے مقابلہ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ شریکِ جنگ تھا.

۹۔ دوما:

اس خاندان کا مسکن اب تک اسی نام سے مشہور ہے، دومۃ الجندل، شمالی عرب میں مدینہ اور شام کے درمیان ایک مشہور مقام ہے، عرب جغرافیہ نویسوں

نے تصریح کی ہے کہ دومۃ الجندل اسی دومہ کی طرف منسوب ہے، پچھلے زمانہ میں یہاں نصاریٰ آباد تھے۔ (۲۳)

۱۰۔ تیماء:

حدود عرب و شام میں اس خاندان کے انتساب سے ایک قدیم آبادی ہے، حضرت ایوب علیہ السلام کے زمانہ میں اس خاندان کو کسی قدر فوجی اہمیت بھی حاصل تھی، سفر ایوب (۶-۱۹) میں تیماء کے سواروں کا ذکر ہے، اشعیا نبی نے بھی (۸۰۰: ق م) سرزمین تیماء کا نام لیا ہے (۲۱-۱۴) زمانۂ اسلام میں یہاں یہود آباد تھے۔ (۲۴)

۱۱۔ قیدماہ (اصحاب الرس):

فارسٹر نے قیدماہ کو کاظمہ (واقع خلیج فارس) کا مرادف سمجھا ہے اور اس لیے اس کو خلیج فارس پر جگہ دیتے ہیں۔ کاظمہ انگریزی لب ولہجہ میں ''کیڈما'' ہو جائے گا، لیکن ہر مشرقی لب وہ لہجہ کا واقف کار اس تحقیق پر ہنس دے گا کہ قیدماہ اور کاظمہ ایک چیز ہے، قرآن مجید میں ایک قبیلے کا نام اصحاب الرس مذکور ہے، بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ قیدماہ ہی کا نام اصحاب الرس تھا، ہمارے ہاں مفسرین اصحاب الرس کی تعیین میں نہایت مشکوک الرائے ہیں، امام طبری نے اربابِ روایت سے تین روایتیں نقل کی ہیں:

① رس کنوئیں کو کہتے ہیں، ایک امت نے اپنے پیغمبر کو کنوئیں میں ڈال دیا تھا، اس لیے اس کو اصحاب الرس کہتے ہیں۔

② رس ملک آذربیجان کے پار ایک آبادی کا نام ہے (شاید رے سے مقصد ہو)

③ رس غار کو کہتے ہیں اور اس سے مراد اصحاب الاخدود ہیں۔

لیکن مؤرخ مسعودی لکھتا ہے: ''اصحاب الرس (حضرت) اسماعیل کی اولاد میں سے تھے، وہ دو قبیلے تھے، ایک کا نام قدمان تھا اور دوسرے کا نام یامین اور کہا گیا ہے کہ وہ رعویل تھا، اور یمن میں تھے۔'' (۲۵)

مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کے مطابق قید مان، قید ماہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے، اصحاب الرس کا اس کے علاوہ کوئی اور حال نہیں معلوم.

قرآن مجید نے اصحاب الرس کا دو مقام پر ذکر کیا ہے، لیکن کوئی حال بیان نہیں کیا، بلکہ صرف گنہگار قوموں کی فہرست کے ضمن میں اس کا نام لیا ہے:

وَعَادًا وَّ ثَمُوْدَ وَاَصْحٰبَ الرَّس (۲۱) (ہم نے تباہ کیا) عاد، ثمود اور اصحاب الرس کو ان سے پہلے (الفرقان)

(دوسری جگہ فرمایا)

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِ وَ ثَمُوْد. اس سے پہلے (حضرت) نوح کی قوم اصحاب رس اور ثمود نے جھٹلایا.

(5) خاندان اسماعیل کی تولیت کعبہ سے معزولی اور بنو جرہم کا دور اقتدار:

اس کے بعد ایک طویل زمانے تک ''بنو جرہم'' یہاں کے اقتدار پر قابض اور مسلط رہے۔ ان کے دور اقتدار میں، مرکزیت کے فقدان نے، کثیر الجہتی حکومت کی حیثیت اختیار کر لی، چنانچہ صورت حال یہ تھی کہ بیت اللہ شریف اور چاہ زمزم کی نظارت مضاض بن عمرو الجرھمی کے پاس تھی، جو بالائی مکہ میں مقام ''قعیقعان'' میں مقیم تھا، جبکہ ایک شخص السمیدع سردار قطوراء، زیریں مکہ میں رہائش پذیر تھا اور جو کوئی بھی اس کے پاس سے گزرتا وہ اس سے چنگی وصول کرتا تھا...... اس دور میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد بیت اللہ شریف اور زمزم کے انتظام سے مکمل طور پر الگ تھلگ ہو چکی تھی. یا کر دی گئی تھی. (۲۸)

کچھ عرصے کے بعد السمیدع اور بنو جرہم کے مابین کسی بات پر لڑائی ہو گئی، جس میں اول الذکر کو قتل کر دیا گیا، اس طرح یہاں کا مکمل انتظام ''مضاض الجرہمی'' کے پاس آ گیا، اور وہ مکہ مکرمہ کا حاکم اعلیٰ بن گیا.

مضاض کے بعد اس کا بیٹا الحارث بن مضاض اور پھر اس کا بیٹا عمرو بن الحارث اس علاقے کے حاکم بنے ...مؤخر الذکر کے زمانۂ اقتدار میں .... ''جرہمی

خاندان'' پر زوال کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ اس دور میں مکہ مکرمہ میں ظلم و فساد پھیل گیا، حتیٰ کہ عین، مسجد حرام میں اعلانیہ فسق و فجور کیا جانے لگا...... (۲۹)

(2) بنوخزاعہ کا دور اقتدار:

فسق و فجور اور ظلم و جور کا یہ سلسلہ جب دراز ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے...... بنو جرہم کی جگہ ایک اور قوم ''بنوخزاعہ'' کو تولیت خانہ کعبہ اور ولایت مکہ مکرمہ کی مسند اقتدار پر'' مسند نشین کر دیا...... (۳۰)

(3) بنوخزاعہ کون تھے؟ اور وہ لوگ یہاں کیسے پہنچے؟

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ''بنوخزاعہ'' عرب کا ایک مشہور قبیلہ ہے، جو بنو ''ازد'' کی ایک شاخ ہے، یہ قبیلہ عمرو بن لحیٰ بن ربیعہ بن حارثہ بن مزیقیاء کی اولاد سے ہے.

یہ لوگ بنو ازد کی دوسری شاخوں کے ہمراہ عہد قدیم میں جنوبی عرب (یمن) سے نقل مکانی کے دوران میں، مکہ مکرمہ کے قریب سے گزرے، تو ان کے زیادہ تر لوگوں نے اپنا سفر جاری رکھا، لیکن لحی اپنے خاندان کے ہمراہ مکہ مکرمہ کے قریب اتر گیا، اس طرح یہ لوگ باقی قبیلے سے الگ ہو گئے...... (۳۱)

اس زمانے میں ''بنو جرہم'' کی ظلم و تعدی کا یہ عالم تھا کہ وہ یہاں آنے والے لوگوں سے ''جبری طور پر ٹیکس وصول'' کرتے تھے، جس کی بنا پر بہت سے لوگوں نے یہاں آنا ترک کر دیا تھا.

قبیلہ ازد کے سردار ثعلبہ بن عمرو نے بنو جرہم سے اجازت مانگی کہ جب تک اس کے کھوجی (رُوّاد) کسی اور مناسب جگہ پر چراگاہ تلاش نہ کر لیں، اس وقت تک اسے حرم میں قیام کی اجازت دے دی جائے، لیکن بنو جرہم نے اسے اجازت نہ دی، جس کے نتیجے میں دونوں قبیلوں میں خوفناک جنگ شروع ہو گئی، جس میں آخر کار بنو جرہم کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح ''مکہ مکرمہ'' کی مسند اور بیت اللہ شریف کی تولیت کا منصب ''بنوخزاعہ'' کے پاس چلا گیا. (۳۲)

اس وقت بنو جرہم کے صرف ایک سردار ''مضاض بن عمرو الجرہمی'' کو اجازت ملی کہ وہ اپنے خاندان اور ہمراہیوں کے ساتھ وہاں سے نقل مکانی کر کے چلا جائے، چنانچہ اس نے ''قنان حلی'' میں سکونت اختیار کر لی، جہاں اس کی اولاد دوسری، تیسری صدی ہجری تک آباد اور مقیم رہی۔ (۴۳)

جب، بنوخزاعہ کو مکہ مکرمہ میں برتری حاصل ہوگئی اور ''بنو جرہم'' کو مجبوراً یہاں سے ترک وطن کرنا پڑا تو انہوں (بنو جرہم) نے بیت اللہ شریف کے سونے سے بنے ہوئے دو ہرن، چند سنہری پتروں والی تلواریں اور دوسری کئی قیمتی اشیاء ''زمزم'' کے کنوئیں میں پھینک دیں اور اسے اوپر سے پاٹ دیا، مقصد یہ تھا کہ فاتحین کے ہاتھ یہاں کا قیمتی سامان نہ آسکے...... اس کے بعد وہ ترک وطن کر کے یمن چلے گئے اور بنوخزاعہ نے بیت اللہ شریف کا انتظام سنبھال لیا...... (۴۴)

اس موقع پر کتب سیر و تاریخ میں ان لوگوں کی طرف چند اشعار بھی منسوب کیے جاتے ہیں، مگر ان کا انتساب مشکوک ہے۔

''بنوخزاعہ'' کے اس قبضے کی خبر جب ان کے ہم قبیلہ افراد کو شمالی عرب (یمن) میں پہنچی تو وہاں سے ان کے مختلف خاندانوں اور افراد کی نقل مکانی اور مکہ مکرمہ میں آبادکاری کا سلسلہ شروع ہو گیا، جن میں ''ربیعہ بن حارثہ الخزاعی بھی شامل تھا، جس نے عامر بن عمرو بن الحارث بن مضاض کی بیٹی ''ضہیرہ'' سے شادی کر لی، اس طرح بیت اللہ کی مسند اقتدار بنوخزاعہ کے دوسرے خاندان کی طرف منتقل ہوگئی۔

(4) مکہ مکرمہ میں بت پرستی کی ابتداء:

اس پر تمام مؤرخین اور سیرت نگار متفق ہیں کہ مکہ مکرمہ کی تاریخ کا ابتدائی دور، جو عمرو بن لحی کے دور اقتدار تک جاری رہا، اس خطے میں مکمل طور پر توحید اور دین اسماعیلی کی اشاعت کا دور تھا۔ اس دور میں اہل مکہ مکمل طور پر توحید پر عامل اور کاربند رہے، لیکن بنوخزاعہ کے ایک سردار ''عمرو بن لحی'' نے یہ سارا منظر نامہ بدل دیا اور اس بد بخت نے اس دار العدل والتوحید کو دار الکفر والشرک بنا دیا۔

نامور مؤرخ الطبری اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے بعض ''اہل علم'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ عمرو بن لحی شام کی طرف اپنے ایک سفر کے دوران میں سرزمین بلقاء کے مقام ''مآب'' سے گزرا، جہاں اس زمانے میں معروف قوم عمالقہ کا ایک گروہ آباد تھا۔ اس نے انہیں مختلف بتوں کی پوجا کرتے ہوئے دیکھا، تو اسے ان کا یہ انداز بہت پسند آیا، اس نے ان سے پوچھا کہ تم لوگ یہ کس کی پوجا کر رہے ہو؟ وہ بولے، یہ ہمارے دیوتا ہیں؟ جب ہمیں بارش کی ضرورت ہوتی ہے تو ہم ان سے بارش طلب کرتے ہیں، یہ ہم پر بارش برساتے ہیں اور جب ہمیں مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو یہ ہماری مدد کرتے ہیں.

اس نے کہا، کیا تم مجھے ان سے کوئی بت دے سکتے ہو؟ تاکہ میں اسے سرزمین عرب میں لے جاؤں، چنانچہ انہوں نے اسے ھبل نامی بت دے دیا، جو اس نے وہاں لے جا کر نصب کر دیا اور لوگوں کو اس کی پوجا پاٹ اور اس کی تعظیم کے لیے دعوت دینا شروع کر دی...... (۳۵)

اس کی اس حرکت کی بنا پر یہ تمام ''علاقہ'' توحید کی بجائے کفر و شرک کا علاقہ بن گیا، اسی بنا پر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مذمت فرمائی ہے...... حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

رأیت عمرو بن عامر الخزاعی فی النار یجر امعاءہ فی النار وکان اول من سیب السوائب (۳۶)	میں نے عمرو بن عامر لحی الخزاعی کو دیکھا کہ وہ اپنی آنتیں جہنم میں گھسیٹ رہا تھا اور وہ پہلا شخص ہے، جس نے ''السوائب'' مقرر کیے.

دوسری روایت میں ہے:

ان اول من سیب السوائب و عبد الاصنام ابو خزاعۃ عمرو بن عامر وانی رأیتہ یجر امعاءہ فی النار...... (۳۷)	سب سے پہلا شخص جس نے جانوروں کو غیر اللہ کے نام پر چھوڑنے کا سلسلہ شروع کیا اور بتوں کی پوجا شروع کی وہ خزاعہ کا جد امجد عمرو بن عامر ہے اور میں نے اسے جہنم میں اپنی آنتیں گھسیٹتے ہوئے دیکھا ہے.

اس نے نہ صرف یہ کہ یہاں بت پرستی کو رواج دیا، بلکہ مشہور قول کی رو سے ''تلبیہ حج وعمرہ'' میں بھی تبدیلی کی اور''لا شریک لک ''کے بعد الا شریکاً ''ھو لک تملکہ وما ملک ''(مگر ایسا شریک جس کا تو مالک ہے، مگر وہ مالک نہیں ہے)، کا اضافہ کیا، گویا اس نے ''شرک'' درآمد کرنے کے علاوہ شرک کا پورا فلسفہ بھی درآمد کیا اور یہاں کے لوگوں کے ذہنوں میں اسے اس طرح راسخ کیا کہ صدیاں گزرنے کے باوجود اس کے اثرات ختم نہ ہو سکے......

بنو اسماعیل کی تاریخ کے اس دور کو، جس میں وہ ''مسند اقتدار'' سے الگ رہے: یہاں کی تاریخ کا دور مظلمہ (Dark-Age) کہا جا سکتا ہے...... اس کا تذکرہ آئندہ باب میں کیا جائے گا.

حوالہ جات وحواشی

(۱) پولس کا خط گلتیوں کے نام۔

(۲) البخاری، ۳۱۶/۶-۳۹۷ (کتاب الانبیاء، باب ۹، حدیث ۳۳۶۴)

(۳) تکوین، ۱۲/۲۱۔

(۴) تکوین، ۱۸/۳۰۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے، کہ مسلم مؤرخین نے توریت سے ہی حضرت اسماعیل کی اولاد کے نام نقل کیے ہیں، لیکن مرور ایام سے ان کی شکلیں کچھ بدل گئی ہیں، مثال کے طور پر حافظ کثیر (البدایہ، ۱۸۴/۲) نے ان کے نام حسب ذیل لکھے ہیں:
(۱) نابت، (۲) قیذر، (۳) منشا، (۴) مسمع، (۵) ماشی، (۶) دما، (۷) اذر، (۸) یطور، (۹) نیشی، (۱۰) طیما، (۱۱) قیذ ما، (۱۲) نسمۃ، (زوجہ عیصو بن اسحاق)؛ جبکہ محب الدین افندی الخطیب نے ان کے حسب ذیل نام، روایت کیے ہیں:
(۱) نابت، (۲) قیدار، (۳) یطور، (۴) تیما، (۵) دومہ، (۶) مسمع، (۷) قدمہ، (۸) ادب ایل، (۹) نفیس، (۱۰) مبسام، (۱۱) الھمیسع، (۱۲) حداد، (حواشی البدایہ، ۱۴۸/۲)...... نامور عرب مؤلف ابن سعد نے ان کے نام درج ذیل طریقے پر لکھے ہیں: (۱) یناوذ (نبت اور نابت) (۲) قیذر، (۳) اذبل، (۴) منسی، (منشی) (۵) مسمع (مسماعہ)، (۶) دما، (دوما) (۷) ماشی، (۸) اذر، (اذور) (۹) طیما، (۱۰) یطور، (۱۱) نبش، (۱۲) قیذ ما، (ابن سعد، ۵۱/۱)۔

(۵) تکوین، ۲۵/۱۳-۱۵۔

(۶) ابن سعد، ۳۲/۱؛ ابن کثیر، البدایہ، ۱۸۴/۲۔ ابن سعد میں صراحت ہے کہ سب سے پہلے

اس خاندان میں جس شخصیت نے عربی زبان میں کلام کیا۔ وہ رعلہ بنت یعرب ....
ہے۔

(۷) مولانا سید سلیمان ندوی، ارض القرآن، مطبوعہ لاہور. اس حصے میں زیادہ تر مولانا سید سلیمان ندوی کی تحقیقات پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی اس حوالے سے تحقیقات ان کی برس ہا برس کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔

(۸) تکوین، ۲۰/۳۷.

(۹) مولانا سید سلیمان ندوی، ص ۲۸۷.

(۱۰) قضاۃ، ۶/۷-۸.

(۱۱) ایضاً، ۲۶/۸.

(۱۲) تاریخ مکہ المکرمہ، ۱۶۸/۱.

(۱۳) تکوین، ۲۸/۳۷-۳۶.

(۱۴) تکوین، ۳۹/۳۰.

(۱۵) قضاۃ، ۲۴/۸.

(۱۶) تکوین، ۲۹/۳۰.

(۱۷) ارض القرآن، ص ۲۸۸، بحوالہ ایام، ۲۰/۱۵.

(۱۸) ایضاً، ص ۲۸۸-۲۸۹.

(۱۹) ایضاً، ۲۸۸.

(۲۰) ایضاً، ص ۲۸۸-۲۸۹.

(۲۱) Forestar، ۲۸:۱، بحوالہ سید سلیمان ندوی، ص ۲۸۸

(۲۲) ایضاً ص ۲۸۹.

(۲۳) ایضاً ص ۲۸۹.

(۲۴) ایضاً ص ۲۸۹.

(۲۵) ایضاً ص ۲۹.

(۲۶) الفرقان (۳۸/۲۵).

(۲۷) ق (۱۲/۵۰).

(۲۸) ابن کثیر، البدایہ،۲/۸۵).

(۲۹) اس سلسلے میں مؤرخین نے "اساف و نائلہ" کے بت بننے کے واقعے کا بھی تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان دونوں کو یہاں بدکاری کرنے کی بنا پر، بطورِ سزا پتھر بنا دیا گیا، لیکن یہ تمام قصہ بے اصل اور بے سند ہے۔

(۳۰) البدایہ،۱/۱۸۵.

(۳۱) حوالہ مذکور: نیز دیکھیے عمر رضا کحالہ، معجم قبائل العرب،۱/۳۳۸۔ بذیل مادہ۔ خزاعہ.

(۳۲) عربی میں قبیلے یا قافلے سے الگ ہونے کے لیے "الخزع" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسی بنا پر لحی کے خاندان کے لیے "خزاعہ" کا نام پڑ گیا۔ جس کے معنی الگ اور متفرق ہونے کے ہیں (البدایہ).

(۳۳) الازرقی، اخبار مکہ.

(۳۴) سید سلیمان ندوی، ارض القرآن، ص ۲۸۷.

(۳۵) اردو دائرہ معارف اسلامیہ،۸/۹۳۰.

(۳۶) البخاری،۸/۳۸۳ (کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ المائدۃ)، حدیث ۴۶۲۳.

(۳۷) البدایہ،۲/۱۸۵۔ حافظ ابن کثیر نے اس روایت میں آنے والے لفظ "ابو خزاعہ" (خزاعہ کے باپ) کو یا تو راوی کے سہو پر محمول کیا ہے، یا پھر مجاز پر، اس لیے کہ صحیح روایات کی رو سے "عمر بن لحی، بنو خزاعہ کا ایک سردار تھا، اس قبیلے کا بانی اور جدامجد نہ تھا، بلکہ یہ قبیلہ تو بہت قدیم زمانے سے یہاں آباد چلا آتا تھا.

باب 6

بنو اسماعیل کا دورِ مظلمہ

(بنو جرہم کے دورِ اقتدار سے لے کر جناب قصی بن کلاب تک)

بنو اسماعیل، کچھ عرصہ کعبہ معلیٰ کی تولیت پر قابض رہنے کے بعد، وہاں سے بے دخل کر دیئے گئے اور بعد ازاں ''مکہ مکرمہ'' میں جو سیاسی تبدیلیاں آئیں ان میں وہ مکمل طور پر غیر جانب دار رہے اور انہوں نے اقتدار اور تولیت خانہ کعبہ کا میدان مکمل طور پر دوسری اقوام کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔ جس کی بنا پر مسند اقتدار پر کبھی بنو جرہم متمکن نظر آئے اور کبھی بنو خزاعہ...... تاہم اس غیر جانب داری نے انہیں ''سیاسی'' اعتبار سے بہت نقصان پہنچایا۔

قاعدہ ہے کہ اقوام کی ''معاشرتی'' حیثیت ان کی سیاسی حیثیت کے تابع ہوتی ہے اور لوگ انہی قوموں کی تعظیم وتکریم کرتے ہیں جن کے قدم مسند اقتدار کو زینت بخشتے ہیں۔

''اولاد بنی اسماعیل'' کے ساتھ بھی یہی ہوا جیسے ہی وہ ''مسند اقتدار'' سے الگ ہوئے ان کے متعلق لوگوں کی نظریں بدل گئیں اور وہ ماحول جہاں وہ برسوں اقتدار پر متمکن رہے تھے ان کے لیے اجنبی اور بیگانہ ہو گیا...... حالات کی اس تبدیلی نے ''بنو اسماعیل'' کو فوری طور پر نہ سہی، لیکن رفتہ رفتہ دوسرے علاقوں اور دوسرے شہروں میں منتقل اور منتشر ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح ایک طرف تو ''مکہ مکرمہ'' سے ان کی غیر اعلانیہ نقل مکانی کا سلسلہ شروع ہو گیا اور دوسری طرف سرزمین عرب کے ایسے علاقے اور خطے ان کی آماجگاہ بنتے چلے گئے جہاں ان سے قبل بہت کم انسانی قدم پہنچے تھے۔ یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا...... اور پھر قدرت کو جب

دوبارہ اس خاندان کے لوگوں سے بیت اللہ شریف کی خدمت لینا منظور ہوا تو عرب کے مختلف علاقوں اور خطوں پر پھیلے ہوئے انہی قبائل نے اس بارے میں مرکزی کردار ادا کیا اور اس طرح بہت جلد نہ صرف سرزمین مکہ، بلکہ پورا جزیرۂ عرب اس خاندان کے لوگوں سے معمور ہو گیا اور یوں اللہ تعالیٰ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے متعلق کیا ہوا وہ عہد پورا ہو گیا جس میں کہا گیا تھا، کہ ''میں اس کی اولاد کو ایک بڑی قوم بناؤں گا'' چنانچہ مؤرخین نے صراحت کی ہے:

ثم جميع عرب الحجاز على اختلاف قبائلهم يرجعون الى انسابهم الى ولديه نابت و قيدار[1]	پھر حجاز کے تمام عرب قبائل مختلف ہونے کے باوجود، اپنے نسب میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بیٹوں نابت اور قیدار کی طرف ہی لوٹتے ہیں.

گویا اولاد اسماعیل پورے ''حجاز'' میں پھیل گئی اور اس پورے خطے کی سرزمین ان کے وجود سے لہلہانے لگی۔ انتہا یہ ہے کہ بعض مؤرخین نے قبیلہ خزاعہ کو بھی اولاد اسماعیل میں سے شمار کیا ہے[2]، جو اصلاً یمن کے رہنے والے تھے۔ اس طرح تاریخ عرب کا یہ دور بھی ''اولاد اسماعیل'' کے لیے بہت ہی برکات و فوائد کے حصول کا ذریعہ بن گیا۔ بنو اسماعیل اور نبی اکرم ﷺ کے اجداد کی تاریخ کے اس دور میں حسب ذیل افراد، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں:

(۱) عدنان (جد عربی قبائل حجاز)

امام السہیلی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ''عدنان'' کا لفظ فعلان کے وزن پر ہے، جو عدن (بمعنی قیام) سے مشتق ہے۔ جناب عدنان اکیسویں پشت پر نبی اکرم ﷺ کے جد امجد ہیں۔ ان کی کنیت ابو معد تھی۔ وہ اد کی اولاد تھے۔ ابن حزم کے مطابق الحارث ہی عک کہلاتے ہیں۔ مصعب الزبیری کے مطابق ان کی والدہ کا نام مھدد بنت لھم تھا۔ ان کے ہاں چار بیٹے معد، دیت، اعی اور عدین تھے.

جناب عدنان کے دو بھائی تھے۔ نبت بن اد اور عمرو بن اد[3]، جیسا کہ اوپر

ذکر آیا ہے، حضرت اسماعیل کی اولاد کا ایک بڑا گروہ جس میں قریش مکہ (آنحضور ﷺ کا خاندان) بھی شامل ہے، ''عدنان'' سے نسبت کی بنا پر عدنانی کہلاتا ہے اور مؤرخین اور سیرت نگاروں نے خود نبی اکرم ﷺ سے مرفوع روایت کے ساتھ آپ کا جو نسب نامہ نقل کیا ہے، وہ انہی عدنان تک پہنچا ہے۔

اسی لیے حضرت عدنان تک نبی اکرم ﷺ کا نسب نامہ، متفق علیہ ہے...... البتہ عدنان سے اوپر نسب نامہ میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے واسطے سے نبی اکرم ﷺ سے اس کے بعد یہ الفاظ مروی ہیں۔

كذب النسابون، مرتين او ثلاثاً (۳) نسب دانوں نے جھوٹ بولا، (یہ بات آپ ﷺ نے دومرتبہ کہی یا تین بار)۔

تاہم صحیح قول یہ ہے کہ مرفوع حدیث نہیں ہے، بلکہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عباس کا قول ہے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''ہم عدنان سے ہی نسبت رکھتے ہیں اور اس سے اوپر کے بارے میں ہمیں علم نہیں کہ صحیح کیا ہے۔'' بہر حال ابن ہشام نے اوپر کے بزرگوں کا حسب ذیل نسب نامہ دیا ہے: عدنان بن اد (یا آدو) بن مقوم بن ناحور بن تیرح بن یعرب بن یشجب بن نابت بن اسماعیل علیہ السلام (۴)

لیکن صحیح قول یہی ہے کہ عدنان سے لے کر حضرت اسماعیل علیہ السلام تک افراد کی تعداد اور ان کے ناموں میں اختلاف ہے، اس میں حسب ذیل امور میں اختلاف ہے:

(ا) تعداد افراد:

عدنان اور اسماعیل کے مابین موجود اشخاص کی تعداد میں حسب ذیل اقوال آتے ہیں:

(الف) چالیس افراد:

متعدد مؤرخین نے بعض اہل کتاب (مثلاً کتاب اخیا کاتب ارمیاء بن حلقیا) کے حوالے سے لکھا ہے کہ دونوں کے مابین چالیس افراد ہیں...... (۵)

(ب) دوسرے اقوال:

اس کے علاوہ تیس، بیس، پندرہ، دس، نو، سات اور چار افراد کے قوال بھی ملتے ہیں۔[6] (تفصیل، مقدمہ کتاب میں گزر چکی ہے)

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر...... ''نسب دان'' مشہور معروف لوگوں کے نام بیان کرتے تھے اور غیر معروف لوگوں کے نام چھوڑ دیتے تھے۔

علاوہ ازیں عدنان اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مابین جو زمانہ ہے، وہ اتنا طویل ہے کہ ان کے درمیان محض چار، سات، یا دس یا بیس افراد کا ہونا مناسب نظر نہیں آتا، اس لیے کہ زمانہ اس سے زیادہ طویل ہے۔

چنانچہ امام السہیلی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ''معد بن عدنان'' ''بخت نصر'' کے زمانے میں بارہ برس کے تھے[7] اور ''بخت نصر'' جس کا تذکرہ یہودیوں کی متعدد کتابوں، مثلاً سلاطین، عزرا، نحمیاہ، آستر، ارمیا اور کتاب دانیال وغیرہ میں ملتا ہے کا انتقال ۵۱۶ ق م میں ہوا[8]، جس کا مطلب یہ ہے کہ ۵۱۶ ق م۔ میں حضرت معد کی ولادت کو ابھی بارہ برس گزرے تھے۔ اس طرح ان کے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مابین ۱۳۷۶ برس کا فاصلہ قرار پاتا ہے اور اتنے طویل عرصے میں دس پندرہ یا بیس اجداد کا ہونا درست نہیں ہے، یقیناً ان کی تعداد زیادہ ہو گی۔ چنانچہ امام الطبری رحمہ اللہ وغیرہ نے العنانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مابین چالیس اجداد کا فاصلہ ہے[9]، لیکن انہوں نے آنحضور ﷺ کے اجداد کی جو فہرست دی ہے اس میں اضطراب پایا جاتا ہے[10]...... تاہم اس بات پر تمام مؤرخین اور نسب دانوں کا اتفاق ہے کہ حضرت عدنان کا نسب نامہ حضرت قیدار (یا قیدر) بن اسماعیل تک پہنچتا ہے اور حضرت قیدار اپنے زمانے میں بادشاہ تھے اور ''قیدار'' کے معنی بادشاہ کے ہیں...... [11] حضرت عدنان کے دوسرے حالات نامعلوم ہیں۔

عدنان کے متعلق انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (لائیڈن) کا مقالہ نگار کاسکیل

(W.Kaskel) لکھتا ہے کہ وہ شمالی عربوں کا جد امجد تھے اور شمال مغربی عرب کے نبطی کتبوں میں یہ نام دو جگہ آیا ہے۔ یعنی عبد عدنون اور عدنون۔ (۳۔الف)

اور یہ نام نووی کتبوں میں بھی ملتا ہے۔ اور لوبان کی شاہراہوں کے ساتھ ساتھ جنوبی عرب میں لایا گیا تھا۔

(۲) معد بن عدنان

آنحضور ﷺ کے قدیم اجداد اور بزرگوں میں سے نسب نامہ کی بیسیوں پشت میں ایک اور قابل ذکر شخصیت ''حضرت معد بن عدنان'' کی ہے، جو معروف حکمران ''بخت نصر'' کے معاصر تھے۔ ان کی کنیت ابوفزار، ابو قضاعہ اور ابو وحیدہ تھی۔ بعض کتابوں میں ان کی والدہ کا نام مہدد بنت لھم بن جلحب بن جدیس بن جاثر بن ارم مذکور ہے (۱۲)، اس طرح جناب عدنان کے دوسرے بھائی ''عمرو'' کے حالات بھی نامعلوم ہیں۔

ان کے متعلق امام الطبری رحمۃ اللہ علیہ نے حسب ذیل روایت لکھی ہے:

اللہ تعالیٰ نے حضرت ارمیا بن حلقیاء کی طرف وحی بھیجی کہ: تو بخت نصر کے پاس جا اور اسے بتا کہ اللہ تعالیٰ نے ''بخت نصر'' کو اہل عرب پر بھی اسی طرح مسلط کر دیا ہے جس طرح کہ اسے ان کی قوم (بنی اسرائیل) پر مسلط کر دیا ہے، اور تو ''معد بن عدنان'' کو جا کر لے آ، اس لیے کہ میں ان کی اولاد میں ایک محتشم نبی پیدا کروں گا، جس پر نبوت ختم کر دی جائے گی، چنانچہ وہ ان کے پاس بخت نصر پہلے پہنچ گئے اور معد بن عدنان سے ملاقات کی اور پھر انہوں نے معد کو براق پر، اپنے پیچھے بٹھایا اور حران پہنچ گئے اور زمین (حضرت) ارمیا کے لیے لپیٹ دی گئی۔ (۱۳)

اس روایت کی رو سے حضرت معد نے وہیں ایک عورت (معانہ بنت جوشن یا ناعمہ) سے، جو قبیلۂ دب بن ''جرھم'' سے تعلق رکھتی تھی، شادی کر لی، اسی لیے کہ اسرائیلیوں کی کتابوں میں ان کا نسب نامہ مذکور ہے (۱۴)، بقول ابن سعد معانہ کی والدہ کا نام سلمیٰ بنت الحارث بن مالک بن لخم تھا، وہ قبیلہ لخم سے تعلق رکھتی

تھی (۱۵)۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معد بن عدنان بڑی صلاحیتوں والے شخص تھے......ان کے متعلق امام ابو العباس عبداللہ بن محمد الفاسی، جنہوں نے آنحضور ﷺ کے نسب نامے کو نظم میں قلم بند کیا ہے،فرماتے ہیں:

وکان معد عدۃً لولیہ اذا خاف من کید العدو المحارب (۱۶)

(اور معد اپنے ساتھی کے لیے ، اس وقت قابل بھروسہ تھے، جب اسے کسی لڑاکا دشمن کے مکر سے اندیشہ ہوتا؛ مطلب یہ ہے کہ وہ قابل اعتماد بزرگ تھے)

معروف نسب نامہ نگار مصعب الزبیری کے مطابق ان کے دو بیٹے تھے۔ایک کا نام فزار اور دوسرے کا نام قضاعہ تھا۔معد کی والدہ کا نام معانہ بنت جوشن (یا جوشم) تھا۔اور قضاعہ کی والدہ کا نام عکبرہ تھا۔جو قبیلۂ سبا کی ایک خاتون تھی،اس نے قضاعہ کو معد کے بستر پر جنم دیا،لیکن بعدازاں قضاعہ کی نسبت مالک بن حمیر بن سبا کی طرف ہوگئی جن سے غالباً مذکورہ خاتون نے بعد میں شادی کی تھی۔ابن حزم رحمہ اللہ کے مطابق معد کے ہاں چار بیٹوں کی ولادت ہوئی۔یعنی نزار، ایاد، قنص، عبیدالرماح اور الضحاک۔جبکہ البلاذری نے معد کے چودہ بیٹوں کا اور علامہ شامی نے ان کے سترہ بیٹوں کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ نزاز کے سوا تمام لوگ ہجرت کر کے یمن چلے گئے۔(۱۶۔الف)

(۳) نزار بن معد

حضرت معد کے ہاں "نزار" کی ولادت ہوئی،بقول السہیلی رحمہ اللہ النزار کا لفظ "النزر" (بمعنی قلیل) سے ماخوذ ہے، انہوں نے مزید لکھا ہے کہ جب ان کی ولادت ہوئی،تو ان کے والد محترم نے ان کی پیشانی پر،اس نور نبوت کو دیکھا تھا جو آنحضور ﷺ کے اجداد میں ایک سے دوسرے کو منتقل ہو رہا تھا۔وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور قربانی کی اور لوگوں کو کھانا کھلایا اور کہا کہ یہ سب کچھ نزر یعنی بہت کم ہے،اسی بنا پر نومولود کا نام "نزار" رکھا (۱۷)

صاحب الاغانی کے مطابق ان کا یہ نام ان کے یکتائے زمانہ ہونے کی بنا پر

رکھا گیا...... امام الماوردی رحمۃ اللہ علیہ نے نزار نام کی وجہ سے تسمیہ یہ لکھی ہے کہ وہ دبلے پتلے تھے، اس لیے حاکم ایران نے انہیں دیکھ کر کہا...... "اے نزار تجھے کیا ہوا ہے" اور فارسی میں نزار دبلے پتلے شخص کو کہتے ہیں"[18] ...... ابو العباس عبداللہ اپنے قصیدے میں ان کے متعلق فرماتے ہیں:

وحل نزار من رياسة اهله   محلاً تسامى عن عيون الرواقب[19]

(اور نزار اپنے لوگوں کے ہاں مقام کے اعتبار سے ایسے رتبے کو پہنچا، جو حاسدوں کی نظر سے بہت بلند تھی)

ان کی کنیت ابوایاد اور ابوربیعہ تھی۔ انہوں نے خبیہ بنت عک سے اور دوسری روایت کے مطابق سودہ بنت عک سے نکاح کیا۔ جس سے ان کے ہاں مضر اور ایاد کی ولادت ہوئی۔ بعد ازاں انہوں نے حدالہ بنت دعلان بن جوشم سے شادی کی جس سے ربیعہ اور انمار پیدا ہوئے۔[19ب]

(۴) مضر بن نزار

"نسب نامہ نبوی میں نزار کے بعد جو شخصیت اس سلسلۃ الذھب کے لیے منتخب ہوئی وہ حضرت مضر کی ہے...... جناب مضر چار بھائی تھے: ربیعہ، مضر، انمار اور ایاد...... بقول ابن ہشام ایاد اور مضر" دونوں توأم (جڑواں) بھائی تھے۔ ان کی والدہ سودہ بنت عک بن عدنان تھی اور ربیعہ اور انمار کی والدہ شقیقہ بنت عک بن عدنان یا جمعہ بنت عد بن عدنان تھی...... [20] نامور سیرت نگار ابن ہشام نے لکھا ہے کہ "انمار" بنو خثعم اور بنو بجیلہ کے والد ہیں...... جو کہ حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ کا قبیلہ تھا.

مؤرخین نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ عرب کی تاریخ میں "مضر" پہلے شخص تھے، جنہوں نے "حدی خوانی" کی ابتدا کی[21]۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ایک دفعہ وہ اونٹ سے گر گئے تھے، جس سے ان کی ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی، اس موقع پر انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا: "وایدیاہ وایدیاہ" (ہائے میرے ہاتھ، ہائے میرے

ہاتھ)، چونکہ بہت خوش آواز تھے، اس لیے ان کی آواز سے اونٹوں نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ اس طرح حدی خوانی کی ابتدا ہوگئی۔ (۲۲)

جناب مضر کے ہاں دو بیٹے پیدا ہوئے، الیاس اور عیلان ...... ان میں سے اول الذکر نبی اکرم ﷺ کے جد امجد ہیں۔

جناب مضر کو ''مضر الحمراء'' بھی کہا جاتا ہے، اس لیے کہ انہیں ان کی والدہ کی طرف میراث میں ''سونا'' ملا تھا (جسے اس کی رنگت کی بنا پر الحمراء کہا جاتا ہے)۔

الجوہری کے بقول چونکہ گھوڑے ''ربیعہ کے حصے میں آئے تھے، لہٰذا وہ ربیعہ الفرس کہلائے، اور مضر کے حصے میں سرخ رنگ کی اونٹنی یا سونا آیا تھا، اس لیے انہیں ''مضر الحمراء'' ...... کہا جاتا تھا ...... (۲۳)۔ امام السہیلی رحمہ اللہ نے ان کی بابت مسند الفردوس سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا تسبوا امضرو لاربیعه فانهما کانا مؤمنین (۲۴) مضر اور ربیعہ کو برا بھلا مت کہو، اس لیے کہ وہ دونوں مومن تھے۔

شیخ ابوالعباس عبداللہ رحمہ اللہ ان کی بابت فرماتے ہیں:

وفی مضر یستمع الفخر کله اذا اعترکت یوماً زحوف المقانب (۲۵)

قبائل ربیعہ و مضر عرب کے مشہور قبیلے ہیں۔ ربیعہ کی اولاد میں بنو بکر، بنو تغلب اور بنو وائل زیادہ معروف ہیں۔ اور مضر کی اولاد میں سے قیس عیلان ہے اور اس کی اولاد بنو غطفان، بنو سلیم، عبس اور ذبیان ہیں۔

نبی اکرم کے اجداد کی غیر معمولی ذہانت کا واقعہ

علامہ شامی سمیت متعدد سیرت نگاروں نے روایت کی ہے کہ جب نزار بن معد کی وفات کا وقت آیا تو انہوں نے اپنے مال کو اپنے بیٹوں پر تقسیم کر دیا اور وہ چار تھے۔ (۱) مضر، (۲) ربیعہ، (۳) ایاد اور (۴) انمار اور کہا بیٹو! یہ سرخ خیمہ جو چمڑے کا بنا ہوا تھا اور جو مال اس سے مشابہت رکھتا ہے وہ مضر کا ہے۔ اسی لیے مضر کو مضر الحمراء کہا جاتا تھا اور یہ سیاہ خیمہ اور مال جو اس کے مشابہ ہے وہ ربیعہ کا ہے تو

اس نے سیاہ رنگ کے گھوڑے لے لیے، جس سے ربیعہ کو ربیعۃ الفرس کہا گیا اور یہ خادمہ اور جو سفیدی اس کے مشابہ ہے وہ ایاد کا ہے۔ اس خادمہ کا مخلوط رنگ تھا جس میں سیاہی اور سفیدی تھی تو ایاد نے ابلق گھوڑے لے لیے، اور یہ تھیلی اور بیٹھک انمار کی ہے جس میں یہ اپنی نشست رکھے گا تو انمار نے اپنے حصہ کی چیز لے لی۔ انہوں نے بیٹوں سے یہ بھی کہا اگر اشیاء موجودہ کی تقسیم کے بارے میں تم میں اختلاف واقع ہو جائے تو تم کو چاہیے کہ افعٰی بن الافعی جرہمی سے فیصلہ کرا لینا۔ (مذکورہ بالا قصہ ابن الافعٰی جرہمی کے فیصلہ کے بعد عمل میں آیا تھا)۔ پھر جب نزار کا انتقال ہو گیا تو ان کی اولاد میں اختلاف پیدا ہو گیا تو انہوں نے افعٰی کے سامنے اپنا معاملہ پیش کرنے کا ارادہ کیا اس وقت افعٰی نجران کا بادشاہ تھا۔ یہ سب اسے ملنے کو روانہ ہو گئے۔ دورانِ سفر میں مضر کی نظر ایک قطعۂ زمین پر پڑی جس سے کسی جانور نے گھاس چری ہوئی تھی تو کہا کہ جس اونٹ نے یہاں گھاس چری ہے وہ کانا ہے۔ ربیعہ نے کہا وہ لنگڑا بھی ہے (یعنی ایک کروٹ پر جھک کر چلتا ہے) اور ایاد نے کہ اس کی دم کٹی ہوئی ہے اور انمار نے کہا کہ وہ بدکا ہوا ہے۔ ان لوگوں نے تھوڑا ہی راستہ طے کیا تھا کہ ان کو، ایک شخص ملا جس کا ایک اونٹ کھو گیا تھا۔ اس نے ان سے اس کے بارے میں پوچھا تو مضر نے کہا کیا وہ کانا ہے؟ اس نے کہا ہاں، ربیعہ نے کہا کیا وہ لنگڑا بھی ہے؟ اس نے کہا، ہاں۔ ایاد نے کہا: کیا وہ ابتر یعنی دم کٹا بھی ہے؟ اس نے کہا ہاں، انمار نے کہا کیا وہ بدکا ہوا ہے۔ اس نے اس کی بھی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ واللہ یہ سب صفات میرے اونٹ کی ہیں، مجھے بتاؤ کہ وہ کہاں ہے تو ان سب نے قسم کھا کر کہا ہم نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ ان سے لپٹ گیا اور کہنے لگا میں تمہیں کیسے سچا سمجھوں، جب کہ تم نے میرے اونٹ کی تمام نشانیاں ٹھیک ٹھیک بیان کر دی ہیں۔ چنانچہ وہ ان کے پیچھے لگ گیا، یہاں تک کہ جب یہ لوگ نجران پہنچ گئے اور افعٰی جرہمی کے یہاں جا کر اترے تو اس اونٹ والے شخص نے، بادشاہ کو پکار کر کہا کہ ان لوگوں کے ہاتھ میرا اونٹ لگا تھا۔ کیونکہ انہوں نے مجھ سے اس کی تمام علامات بیانِ کی ہیں۔ مگر یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اسے دیکھا بھی نہیں۔ افعٰی نے

ان سے کہا کہ جب تم نے اس کو دیکھا نہیں تو اس کی صفات کیسے بیان کیں۔ اس پر مضر نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ وہ ایک سمت کی گھاس چرتا چلا گیا اور دوسری طرف کی گھاس کو نہیں چھیڑا۔ میں نے اس سے سمجھا کہ وہ کانا تھا۔ ربیعہ نے کہا کہ میں نے زمین پر اس کے ایک پاؤں کے نشان کو پورا اور دوسرا نشان خراب پایا۔ اس سے میں یہ سمجھا کہ وہ اپنے لنگڑے پن کی وجہ سے ایک پاؤں زمین پر سخت ڈالتا ہے اور دوسرے کو رگڑتا ہوا اٹھانے کی وجہ سے خراب کر دیتا ہے۔ ایاد نے کہا کہ میں نے اس کی مینگنیوں کو مجتمع اور اکٹھی دیکھا تو اس سے یہ سمجھا کہ اس کی دم کٹی ہوئی ہے اور اگر وہ دم والا ہوتا، تو اس کے دم ہلانے سے اس کی مینگنیاں متفرق ہو جاتیں اور انمار نے کہا میں نے دیکھا کہ زمین کا ایسا حصہ جہاں گھاس خوب گنجان ہے وہاں سے کچھ کھائی گئی۔ پھر دوسری اس جگہ کی گھاس کھائی گئی جو اس سے خراب اور بدتر جگہ ہے، جہاں کم گھاس ہے میں اس سے سمجھا کہ وہ بدکا ہوا ہے۔ (ورنہ اچھی جگہ سے جم کر کھاتا رہتا)

افعٰی نے ان لوگوں کا بیان سن کر اونٹ والے سے کہا کہ ان لوگوں سے تیرے اونٹ کا تعلق نہیں ہے تو اسے کہیں اور جا کر تلاش کر۔ پھر ان سے پوچھا کہ تم کون ہو تو ان لوگوں نے اپنا قصہ بیان کیا اس نے ان کو مرحبا کہا پھر بولا کہ باوجود اس قدر فہم و ذکاء کے جس کو میں دیکھ چکا ہوں پھر بھی تم کو میرے فیصلے کی کیسے ضرورت محسوس ہوئی؟ پھر ان کے لیے کھانا اور شراب منگائی گئی، جب وہ طعام و شراب سے فارغ ہوئے تو مضر نے کہا کہ آج تک میں نے ایسی شراب نہیں دیکھی، اچھا ہوتا کہ یہ قبر پر لگے ہوئے انگور کی نہ ہوتی اور ربیعہ نے کہا میں نے آج تک ایسا اعلیٰ گوشت نہیں کھایا، کاش کہ وہ جس بکری کا ہے وہ کتیا کے دودھ سے نہ پرورش کی جاتی اور ایاد نے کہا میں نے آج تک ایسا صاحب شرافت نہیں دیکھا کاش وہ اسی باپ کا بیٹا ہوتا جس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور انمار نے کہا میں نے آج تک ایسی روٹی نہیں دیکھی کیا اچھا ہوتا کہ اس کو حائضہ عورت نہ گوندھتی۔ افعٰی نے ایک شخص کو ان پر متعین کر دیا تھا جو ان کی باتوں پر کان لگائے ہوئے تھا اس شخص نے ان کی پوری

گفتگو اس کو سنا دی۔ بادشاہ نے اس کے بعد ناظم شراب خانہ کو طلب کر کے اس سے پوچھا کہ جو شراب تم نے اب مہیا کی تھی وہ کس طرح حاصل کی گئی تھی اس نے کہا کہ یہ اس انگور سے بنائی گئی ہے جو آپ کے والد صاحب کی قبر پر لگا ہوا ہے۔ ہمارے پاس اس وقت اس سے زیادہ نفیس شراب موجود نہ تھی اور بادشاہ نے بکری کے بارے میں چرواہے سے تحقیق کی تو اس نے اقرار کیا کہ ہم اس کو کتیا کا دودھ پلایا کرتے تھے اور بکریوں میں اس سے فربہ کوئی اور بکری نہ تھی، اس لیے اسی کو ذبح کیا گیا۔ پھر اپنے محل میں جا کر بادشاہ نے اس کنیز سے سوال کیا جس نے آٹا گوندھا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ حائضہ ہے۔ پھر اپنی ماں کے پاس پہنچا اور اپنے باپ کے بارے میں اس سے تفتیش کی تو اس نے بتا دیا کہ وہ ایسے بادشاہ کے ماتحت تھی جس کی اولاد نہیں تھی اس لیے مجھے اس بات سے بڑی گرانی تھی کہ اس کے بعد حکومت کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ تو میں نے اپنے نفس پر ایک ایسے شخص کو قدرت دے دی جو ہمارے یہاں مہمان آیا ہوا تھا جس سے اس سلطنت کا وارث پیدا ہوا۔ اس تحقیق کے بعد بادشاہ ان کی ذکاوت پر حیران رہ گیا اور پھر ان کے پیچھے اس شخص کو لگایا، جس نے ان کی باتیں سنی تھیں کہ ان سے جو کچھ انہوں نے کہا تھا اس کی وجہ دریافت کرے۔ چنانچہ اس شخص نے مل کر ان سے گفتگو کی تو مضر نے کہا کہ یہ شراب اس انگور سے بنائی گئی جو قبر پر لگا ہوا ہے، مجھے یہ بات ایسے معلوم ہوئی کہ شراب کا خاصا ہے کہ جب پی جاتی ہے تو (سرور لاتی ہے) اور غم زائل کرتی ہے، مگر اس کا اثر میں نے اس کے خلاف پایا۔ جب میں نے اس کو پیا تو دل پر غم کا غلبہ ہو گیا۔ ربیعہ نے کہا یہ بات کہ یہ گوشت ایسی بکری کا ہے جو کتیا کے دودھ سے پالی گئی ہے مجھ کو اس سے معلوم ہوئی کہ بھیڑ بکری اور دوسرے حیوانات کا گوشت نیچے اور چربی اوپر ہوتی ہے بجز کتے کہ اس کا گوشت اوپر اور چربی نیچے ہوتی ہے، تو میں نے اس میں کتے کی یہ خاصیت دیکھ کر سمجھ لیا کہ یہ ایسی بکری کا گوشت ہے جس کو کتیا کا دودھ پلایا گیا ہے اور اس سے گوشت نے یہ خاصیت حاصل کی اور ایاد نے کہا کہ بادشاہ نے اپنے اس باپ کا بیٹا نہیں ہے جس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، میں نے اس طرح معلوم کی

کہ اس نے ہمارے لیے کھانا تیار کرایا، مگر خود ہمارے ساتھ نہیں کھایا میں اس سے سمجھا کہ یہ اس کی طبعی حالت اس کے باپ جیسی نہیں ہے، کیونکہ وہ ایسا نہیں کیا کرتا تھا اور انمار نے کہا کہ یہ بات کہ روٹی حائضہ کے گوندھے ہوئے آٹے کی ہے میں ایسے سمجھا کہ روٹی انگلیوں سے توڑنے سے اس کے باریک ریزے ہو جاتے ہیں، مگر اس کے نہیں ہوتے تھے میں اس سے سمجھا کہ اس کو حائضہ نے گوندھا تھا (اس لیے چڑ یلی ہوگئی ہے) اس شخص نے افعٰی کو اس تمام گفتگو سے مطلع کیا۔ پھر اس نے ان سے پوچھا کہ آپ اپنی اپنی روداد سنائیں، جس پر انہوں نے جو کچھ ان کے باپ نے وصیت کی تھی بیان کی اور جو کچھ باہم اختلاف واقع ہوا وہ بھی بیان کیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ جو مال سرخ خیمہ کے مشابہ ہے وہ مضر کا ہے تو اس کے حصہ میں دینار اور سرخ رنگ کے اونٹ آئے۔ اسی لیے مضر کو مضر الحمرأ کہا گیا ہے۔ پھر کہا اور جو اموال سیاہ قبہ کے مشابہ ہیں خواہ چوپائے ہوں یا کچھ اور وہ ربیعہ کا حصہ ہے تو اس کو سیاہ رنگ کے گھوڑے دیئے گئے، اسی لئے اس کو ربیعۃ الفرس کہا گیا اور جو مال اس خادمہ کے مشابہ ہو جس کے رنگ میں سفیدی اور سیاہی ہے وہ ایاد کا ہے تو اس کے حصہ میں ابلق گھوڑے اور گائے اور بیل آئے اور انمار کے حق میں ہموار زمین کو تجویز کیا اس کے بعد یہ لوگ واپس چلے آئے۔ (۲)

(۵) الیاس بن مضر

جناب الیاس اپنے زمانے کے نامور ''سردار'' تھے...... لفظ الیاس کے اشتقاق میں درج ذیل اقوال نقل کیے جاتے ہیں:

(الف) یہ اَلْیِسَ (دھوکہ، ملاوٹ) سے فعیال کے وزن پر ہے...... (بمعنی ہوشیار یا چالاک شخص)

(ب) یہ لفظ اَلسِ اُلْسٌ (بمعنی عقل کے ماؤف یا مختلط ہونے) سے بنا ہے، اس سے مراد ایسا شخص ہے جس کی عقل میں فتور ہو...... جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

انی اذا الضعیف العقل مالوس[27] میں اس وقت کمزور عقل والا اور ماؤف عقل والا ہے۔

(ج) الیس...... (بمعنی بہادر شجاع) سے، افعل کے وزن پر ہے...... اس سے مراد ایسا بہادر اور شجاع شخص ہے جو کبھی میدان سے نہ بھاگے...... جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے

الیس عن حوبائه سخی......[28]

مگر حافظ ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ الیاس ''ایک عبرانی لفظ ہے، جبکہ الزبیر بن بکار کہتے ہیں کہ الیاس کا ہمزہ وصلی ہے اور یہ لفظ السّل (ایک بیماری) سے بنا ہے اور چونکہ حضرت الیاس بن مضر پہلے شخص ہیں جو سل (تپ دق) کی بیماری سے فوت ہوئے اس لیے ان کا نام السل، یا ''اَلِسّا'' پڑ گیا جو مرورِ ایام سے الیاس بن گیا...... واللہ اعلم[29]

جناب الیاس کے متعلق امام السہیلی رحمہ اللہ نے حسب ذیل روایت نقل کی ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تسبوا الیاس فانه کان مومنا[30] الیاس کو برا بھلا مت کہو، اس لیے کہ وہ مومن تھے۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اپنی پشت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تلبیہ سنا کرتے تھے اور یہ بھی نقل کیا ہے کہ الیاس پہلے شخص ہیں جنہوں نے بیت اللہ شریف کے لیے اونٹ کو بطور ''ھدی'' ارسال کیا...... ان کی والدہ الرباب حیدہ بنت معدہ بن عدنان تھی۔ ابو العباس عبداللہ، ان کے متعلق فرماتے ہیں:

والیاس کان الیاس منه مقارناً لا عدائه قبل اعتداد الکتائب[31]

ماہرین انساب کے مطابق جناب الیاس کے ہاں تین صاحبزادوں کی ولادت ہوئی، یعنی مدرکہ، طابخہ اور قمعہ کی۔ مدرکہ اور طابخہ کے ناموں کے متعلق معصب اور ابن حزم نے صراحت کی ہے۔ کہ مدرکہ کا نام عامر (عمرو) اور طابخہ کا نام عامر تھا۔

جناب الیاس بڑی صلاحیتوں والے بزرگ تھے۔ انہوں نے اپنے خاندان میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی باقیات کا احیاء کیا۔

(٦) مدرکہ بن الیاس

جناب الیاس کے صاحبزادے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور جد امجد جناب "مدرکہ بن الیاس" ہیں۔ ان کا یہ نام اس لیے پڑا کہ انہوں نے ایک بھٹکے ہوئے اونٹ کو جا لیا تھا...... اس طرح یہ لفظ "ادراک" (پا لینے یا پیچھے سے جا ملنے) سے مشتق ہے۔[٣٢]

مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ "مدرکہ" کا اصلی نام "عامر بن الیاس" تھا، اور وہ تین بھائی تھے، یعنی، عامر، عمرو اور قمعہ۔ ان کی والدہ کا نام لیلیٰ (خندف) بنت حلوان، بن عمران بن الحاف بن قضاعۃ تھا......[٣٣]۔ مروی ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے کوئی جانور شکار کیا، لیکن ابھی وہ اسے پکا ہی رہے تھے کہ ان کا ایک اونٹ "بدک" کر بھاگ گیا۔ عامر اسی حالت میں اس کی تلاش میں نکلے اور اس کو جا کر پکڑ لائے۔ ان کے بھائی عمرو، بدستور کھانا پکاتے رہے، رات کو جب یہ دونوں بھائی اپنے والد محترم کے پاس آئے اور انہیں یہ قصہ سنایا، تو انہوں نے عامر سے کہا تو "مدرکہ" ہے اور "عمرو" سے کہا تو "طابخہ ہے۔[٣٤] اور ان کی بیوی لیلیٰ اپنے بیٹے کے پیچھے دوڑی تو ان کا نام خندف پڑ گیا۔

ان کے تیسرے بھائی، قمعہ کو بعض نسابوں نے "بنوخزاعہ" کا مورث اعلیٰ قرار دیا ہے، مگر یہ بات درست نہیں ہے، اس لیے کہ بنوخزاعہ کا نسبی سلسلہ "بنوحمر" سے ملتا ہے[٣٥]۔ حافظ ابوالعباس عبداللہ، مدرکہ کی بابت کہتے ہیں:

ومدركة لم يدرك الناس مثله[٣٦] اعف واعلىٰ عن دنى المكاسب

(٧) خزیمہ بن مدرکہ

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور جد امجد حضرت "خزیمہ" بن مدرکہ ہیں، خزیمہ کے معنی کسی شے کو باندھنے اور اس کی اصلاح کرنے کے ہیں ان کی کنیت ابوالاسد ہے۔[٣٧]

جناب خزیمہ دو بھائی تھے، یعنی خزیمہ اور ''ھذیل'' اور ان دونوں کی والدہ (سلمٰی بنت اسلم بن الحاف بن قضاعہ) بنو قضاعہ سے تعلق رکھتی تھیں [۳۸]۔ شیخ ابو العباس عبداللہ ان کی بابت فرماتے ہیں:

ومن قبله ابقیٰ خزیمة حمده تلید تراثِ عن حمید الاقارب [۳۹]

(یعنی اس سے قبل ''خزیمہ'' نے اپنی تعریف کو باقی رکھا، جو ان کی، ان کے قابل تعریف بزرگوں کی طرف سے مملوکہ وراثت تھی)۔

(۸) کنانہ بن خزیمہ

آنحضور ﷺ کے اجداد میں ایک اور بزرگ جناب کنانہ بن خزیمہ ہیں، جن کی اولاد کو ''بنو کنانہ'' کہا جاتا ہے، جناب کنانہ، چار بھائی تھے، یعنی۔ کنانہ، اسد، اسدہ اور الھون [۴۰]۔

''کنانہ'' کے معنی اس تیر کے ہیں جو ''جلد'' سے بنا ہو...... (اور اگر لکڑی سے بنا ہو، تو اُسے جفیر کہتے ہیں) [۴۱]، ان کی والدہ عوانہ (ہند) بنت سعد بن قیس بن عیلان بن مضر تھی، جو کہ سعد بن قیس بن عیلان بن مضر کی بیٹی تھیں [۴۲]

جناب کنانہ بڑے رتبے والے بزرگ تھے، اہل عرب ان کے علم وفضل کی بنا پر ان کے پاس حاضری دیتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی فضیلت و بزرگی کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہے:

''اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے حضرت اسماعیل کا اور حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے جناب کنانہ کی اولاد کا۔ اور ان کی اولاد میں سے قریش کا اور قریش میں سے بنو ہاشم کا اور بنو ہاشم میں سے میرا انتخاب کیا ہے۔'' (الترمذی)۔ یہ بھی مروی ہے کہ وہ لوگوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے متعلق بتایا کرتے تھے، شیخ ابو العباس ان کے متعلق فرماتے ہیں:

لعمری لقد ابدی کنانة قبله محاسن تابی ان تطوع لغالب [۴۳]

(یعنی مجھے اپنی زندگی کی قسم کنانہ اس سے پہلے ایسے محاسن وکمالات دکھا چکے ہیں کہ جنہوں نے کسی غالب شخص کے سامنے جھکنے سے انکار کیا۔)

(۹) نضر بن کنانہ

نبی اکرم ﷺ کے اجداد میں سے، جن بزرگوں کو خصوصی طور پر شہرت حاصل ہوئی، ان میں حضرت نضر رحمہ اللہ (حرف نون پر زبر اور حرف ضاد پر سکون) بن کنانہ بھی شامل تھے۔

''نضر'' کے لغوی معنی ''خالص سونا'' (الذهب بعينه) کے ہیں...... اور ''النضار'' ہر خالص شے کو کہا جاتا ہے۔ (۴۴)

مصطفیٰ السقاء وغیرہ کے نزدیک ان کا ------ یہ نام ان کے چہرے کی چمک کی بنا پر پڑا۔ ورنہ ان کا اصل نام قیس تھا (۴۴۔الف)

بقول امام ابوجعفر الطبری جناب ''نضر'' کا نام قیس تھا (اور غالباً لقب النضر) اور ان کی والدہ کا نام ''برہ بنت مر بن اود بن طابخہ'' بن الیاس بن مضر تھا، جو تمیم بن مر کی بہن تھی۔ (۴۵)

ان کے بیٹے حسب ذیل تھے:

① نضر، ② مالک، ③ ملکان، ④ عامر، ⑤ الحارث، ⑥ عمرو، ⑦ سعد، ⑧ عوف، ⑨ غنم، ⑩ مخرمہ، ⑪ جرول، ⑫ غزوان اور ⑬ حدال، جب کہ ان کے باپ کی طرف سے ایک اور بھائی ⑭ عبد منات تھے، جن کی والدہ تکبیہ یا فکہیہ (الزفراء بنت ھنی بن بلی بن عمرو بن الحاف بن قضاعہ) تھیں (۴۶)...... مگر نامور سیرت نگار ابن ہشام نے صراحت کی ہے کہ جناب کنانہ کے چار بیٹے تھے: یعنی النضر، مالک، عبد منات اور ملکان...... اور عبد مناف کے سوا تمام بھائیوں کی والدہ برہ بنت مرّ بن طابخہ تھیں۔ اور ان کے باقی بھائی دوسری والدہ سے ہیں۔ جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ نضر، مالک اور ملکان کی والدہ برہ بنت مر قیس اور عبد مناف کی والدہ ھالہ بنت سوید بن الغطر یف تھیں جن کا تعلق ازدشنوءہ سے تھا...... (۴۸)

قریش کون ہیں؟

یہاں یہ سوال بھی اٹھایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بزرگوں میں سے قریش

کون تھے؟ جن کو اولاد کو "قریشی" (قرشی) کہا جاتا ہے۔ اس بارے میں کئی اقوال مروی ہیں کہ جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(الف) اولاد نضر بن کنانہ قریش ہے

مشہور قول یہ ہے کہ جناب "نضر" بن کنانہ کا لقب قریش تھا، لہٰذا ان کی اولاد "قریش" (قریشی) کہلاتی ہے، نامور سیرت نگار ابن ہشام نے اسی قول کو ترجیح دی ہے، وہ لکھتے ہیں:

النضر قریش فمن کان من ولده فهو قرشي ومن لم يكن من ولده فليس قرشي (۴۹)

"نضر" ہی قریش تھے، لہٰذا ان کی اولاد ہی کو قریشی کہا جاتا ہے اور جو ان کی اولاد میں نہیں ہے وہ قریشی نہیں ہے۔

یہ روایت اہل عرب میں اتنی معروف تھی کہ بہت سے شعرا نے اسے اپنے اشعار میں نظم کیا ہے، مثال کے طور پر نامور مخضرم شاعر جریر بن عطیہ اموی حکمران ہشام بن عبدالملک کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

فما الام التی ولدت قریشاً — بمفرقة النجار ولا عقیم

وما قرم بانجب من ابیکم — وما خال باکرم من تمیم (۵۰)

(وہ ماں جس نے قریش (نضر) کو جنم دیا حسب ونسب کے الگ ہونے کی جگہ ہے اور نہ بانجھ اور کوئی شخص تمہارے باپ سے زیادہ شریف ہے اور نہ کوئی ماموں بنوتمیم سے زیادہ معزز ومحترم ہے)۔ یہاں ماں سے مراد "برہ بنت مر" ہیں، جو تمیم بن مرہ کی بہن تھی۔ اس طرح وہ تمام قریشیوں کے ماموں قرار پاتے ہیں۔ نامور محدث اور مؤرخ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اسی رائے کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ یہی ہشام بن محمد بن السائب الکلبی، ابوعبیدہ، معمر بن المثنی اور امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے، اس مسلک کی تائید میں متعدد روایات بھی مروی ہیں، مثلاً ایک صحابی حضرت اشعث بن قیس فرماتے ہیں:

"میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بنو کندہ کے وفد میں شامل ہو کر، حاضر

ہوا تو...... میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ ہم یہ گمان کرتے ہیں کہ آپ لوگ ہم میں سے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: ہم ''النضر بن کنانہ'' کی اولاد ہیں، نہ تو ہماری ماؤں پر شک کیا گیا اور نہ ہی ہمارے والدوں نے ہماری نفی کی، ''اشعث بن قیس کہتے ہیں کہ اگر میں نے کسی کو ''نضر بن کنانہ کی اولاد کے قریشی ہونے کے نفی کرتے ہوئے دیکھا، تو میں اس کو کوڑے لگاؤں گا''(۵۱)

ایک مرتبہ بنو کندہ کا ایک شخص (الجیش) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ ہم لوگ گمان کرتے ہیں کہ عبد مناف ہم میں سے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اس سے منہ پھیرلیا۔ اس نے دوسری مرتبہ یہی بات کہی، تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے پھر منہ پھیرلیا۔ اس نے تیسری بار پھر یہی بات کہی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہم النضر بن کنانہ کی اولاد ہیں، ہم اپنی ماؤں پر شک کرتے ہیں اور نہ ہی ہمارے والدوں نے ہماری نفی کی۔ اشعث نے اس سے کہا کہ تو ایک مرتبہ کہہ کر خاموش کیوں نہ ہوگیا کہ تمہاری اس حرکت نے اس رائے کو نبی اکرم ﷺ کی زبان سے رد کروادیا۔ (۵۲)

(ب) دوسرا قول: فہر بن النضر کی اولاد قریشی ہے:

دوسرا قول یہ ہے کہ ان کے صاحبزادے جناب ''فہر بن النضر اور ان کی اولاد'' کو قریشی کہا جاتا ہے، لہٰذا ان کی اولاد ہی ''قریشی'' ہے، تاہم سیرت نگاروں نے اس قول کو ''ویـقــال'' (اور کہا جاتا ہے) کے ساتھ روایت کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قول کمزور اور ضعیف ہے. (۵۳)

امام السہیلی رحمہ اللہ نے عمرو بن ابی بکر الموٴملی کی وساطت سے عبداللہ بن مصعب سے نقل کیا ہے، کہ فہر بن مالک کا لقب قریش تھا، لہٰذا ان کی اولاد ہی کو قریش کہا جاتا ہے. (۵۴)

ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی ابو عمرو کے حوالے سے لکھا ہے کہ جو لوگ اس وقت قریش کہلاتے ہیں، ان سب کا سلسلہ ''فہر بن مالک'' تک ہی پہنچتا ہے۔ اس کے بعد،

انہوں نے اسی قول کو الزبیر بن بکار، مصعب بن الزبیر اور علی بن کیسان کا مختار قول قرار دیا ہے۔ (۵۵)

(ج) قصی بن کلاب کی اولاد قریشی ہے:

تیسرا قول یہ ہے کہ ''قصی بن کلاب'' کا لقب قریشی تھا اور انہی کی اولاد کو ''قریشی'' کہا جاتا ہے (۵۶)، لیکن جمہور کے نزدیک اول الذکر قول ہی زیادہ صحیح ہے.

یاد رہے کہ قصی بن کلاب ......ہی وہ بزرگ ہیں، جنہوں نے صدیوں کے بعد بیت اللہ شریف کا قبضہ بنوخزاعہ سے واگزار کرایا اور قریش مکہ کے مختلف خاندانوں کو مکہ مکرمہ میں جمع کیا۔ جس کی تفصیل آئندہ بیان ہوگی۔

2- قریش کی وجہ تسمیہ:

قریش کو قریش کیوں کہا گیا؟ اس کی وجہ تسمیہ میں حسب ذیل اقوال مروی ہیں:

(الف) انتشار کے بعد یکجہتی:

لغت نگاروں نے لکھا ہے، کہ لفظ قریش ''التقرش'' سے بنا ہے۔ جس کے معنی التجمع بعد التفرق (افتراق کے بعد یکجہتی) کے ہیں اور جناب نضر بن کنانہ کی اولاد کو اس لیے قریش کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ سب اکٹھے ہو گئے تھے...... (۵۷) دوسرے قول کی رو سے چونکہ قریشی خاندانوں کو جمع کرنے کا یہ کام جناب قصی بن کلاب کے زمانے میں مکمل ہوا، اس لیے ان کے لیے یہ لقب زیادہ موزوں دکھائی دیتا ہے۔ (۵۸)

۲۔ تقرّش: تکسّب وتجارت:

بعض علمائے لغت کے مطابق قریش تقرش، بمعنی اکتساب وتجارت سے ماخوذ ہے۔ نامور سیرت نگار السہیلی کہتے ہیں کہ ''القرش'' کے معنی الکسب (پیشہ) اور الجمع (اکٹھے) ہونے کے ہیں اور چونکہ قدیم زمانے سے، ان لوگوں نے تجارت کو بطور پیشہ اپنا لیا تھا۔ اس لیے ان قبائل کا نام قریش پڑ گیا..... انہوں نے رؤبہ بن العجاج

کے حسب ذیل شعر سے بھی استنباط کیا ہے:

قد کان یغنیهم عن الشغوس والخشل من تساقط القروش
شحم و محض لیس بالمغشوس[۵۹]

(یعنی انہیں گندم، پازیبوں اور کنگنوں کے سروں کی تجارت والی ذلت سے چربی اور خالص دودھ بے نیاز کر دیتا ہے)

۳۔ التقرش (محتاجی سے بے نیاز کرنا)

بعض علمائے لغت نے قریش کے لفظ کو تقرش عن الحاجه (لوگوں کو محتاجی سے بے نیاز کرنے) سے ماخوذ قرار دیا ہے، چنانچہ نامور سیرت نگار اور مؤرخ ہشام الکلبی رحمہ اللہ کہتے ہیں، کہ "النضر بن کنانہ کو اس لیے "قریش" کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کی ضرورتوں کا کھوج لگاتے تھے اور پھر ان کی ضرورتوں کو اپنے مال سے پورا کرتے تھے...... اور ان کی اولاد حج کے لیے آنے والے لوگوں کی ضرورتیں معلوم کرتی اور پھر ضرورت مندوں کو اتنا سرمایہ دیتی تھی کہ جس سے وہ لوگ اپنے اپنے گھروں تک بخیریت پہنچ جاتے۔ اس لیے ان کے اس عمل کی بنا پر انہیں قریش کہا گیا اور (نامور عرب شاعر) حارث بن حلزہ کہتا ہے۔

ایها الناطق المقرش عنا عند عمرو فهل له لذالک بقاء[۶۰]

(اے عمرو (بن ھند، بادشاہ) کے پاس لوٹنے اور ہمارے متعلق خفیہ باتوں کی ٹوہ لگانے والے، کیا اس نے سدا رہنا ہے)

۴۔ قریش ایک سمندری جانور:

نامور مؤرخ الزبیر بن بکار نے لکھا ہے کہ قریش "قرش" کی تصغیر ہے، جو ایک سمندری جانور یا مچھلی کا نام ہے، جو کہ دوسری مچھلیوں کو کھا لیتی ہے، اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے[۶۱] کہ یہ قبیلہ دوسرے قبیلوں سے بڑا (ابو القبیلہ) ہے

وقریش هی التی تسکن البحر بها سمیت قریش قرشاً

(قریش وہ جانور ہے جو کہ سمندر میں رہتا ہے اور اس کی بنا پر قریش کو قریش

کہا جاتا ہے)

نامور محدث امام البیہقی رحمہ اللہ نے ابورکالہ العامری سے یہ نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا، کہ ''قریش'' کو قریش کیوں کہا جاتا ہے تو انہوں نے کہا کہ ایک ایسے جانور کی بنا پر، جو سمندر میں رہتا ہے اور جو سب سے بڑا جانور ہے اور وہ جس چھوٹی یا بھاری شے کے پاس سے گزرتا ہے تو اسے لازمی طور پر کھالیتا ہے،......اور پھر انہوں نے الجمحی کا مذکورہ بالا شعر پڑھا......(٦٢)

بہر حال وجہ کچھ بھی ہو اور اس کی وجہ تسمیہ کے ضمن میں جو توجیہ بھی قبول کیا جائے ..... ثقہ اور مستند قول یہی ہے کہ اس قبیلے کے لیے لفظ ''قریش'' کا استعمال النضر بن کنانہ اور ان کی اولاد کے لیے ہوتا ہے۔

جناب النضر بہت ہی اعلی اخلاق و صفات کے حامل انسان تھے، شیخ ابوالعباس عبداللہ ان کے متعلق فرماتے ہیں:

وللنضر طول يقصر الطرف دونه بحيث التقى النجوم الثواقب (٦٣)

(یعنی اور ''نضر'' کی شخصیت میں اتنی طوالت تھی کہ نگاہ اس کے دیکھنے سے قاصر رہتی، یہاں تک کہ وہ چمکدار ستاروں سے جاملتی تھی)

نضر بن کنانہ کے دو بیٹے تھے۔ مالک بن النضر، اور مخلد بن النضر۔ اول الذکر کی والدہ عاتکہ بنت عدوان بن عمرو تھیں، لیکن یہ معلوم نہیں کہ مخلد کی والدہ وہی ہیں یا کوئی اور خاتون ہے۔ ابوعمر والمدنی کے مطابق ان کے تیسرے بیٹے الصلت بن النضر تھے۔ اور ان سب کی والدہ بنت سعد بن ظرب العدوانی تھیں۔

(١٠) مالک بن النضر

جناب مالک النضر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور جد امجد ہیں، ان کی کنیت ابوالحارث تھی۔ نامور سیرت نگار ابن اسحاق کے مطابق وہ دو بھائی تھے۔ ''مالک اور مخلد بن النضر'' ..... ابن ہشام رحمہ اللہ نے تیسرے بھائی ''الصلت'' کا بھی ذکر کیا ہے۔ مصعب الزبیری اور علامہ شامی کے مطابق نضر بن کنانہ ہی اپنے والد کے اکیلے

جیسا کہ ہم سابق اوراق میں ذکر کر آئے ہیں اس بارے میں اور بھی کئی اقوال ہیں۔

وہ بڑی صلاحیتوں والے اور عمدہ خطابت والے بزرگ تھے، جیسا کہ شیخ ابوالعباس عبداللہ ان کے متعلق کہتے ہیں:

وکانت لفهر فی قریش خطابة　　　یعوذ بها عند اشتجار المخاطب (۶۹)

(''قریش'' میں فہر کو ولایت کا درجہ حاصل تھا، مخاطب کے پریشان ہونے کے وقت ان کی پناہ لی جاتی تھی)۔

جناب فہر کے ہاں پانچ اولادیں ہوئیں، چار بیٹے: غالب بن فہر، محارب بن فہر، الحارث بن فہر اور اسد بن فہر اور ایک بیٹی جندلہ...... جویریوع بنت حنظلہ بن مالک بن زید بن مناۃ بن تمیم کی والدہ ہیں...... ان سب کی ماں لیلیٰ بنت سعد بن ھذیل بن مدرکہ تھیں...... جریر بن عطیہ الخطفی اپنے ایک قصیدے میں ان کے متعلق کہتا ہے:

واذا غضبت رمی ورائی بالحصیٰ　　　ابناء جندلة کخیر الجندل (۷۰)

(اور جب میں غضبناک ہوتا ہوں، تو میرے پیچھے ''جندلہ'' کے بیٹے جندل کی طرح کنکریاں مارتے ہیں)۔

(۱۲) غالب بن فہر

جناب غالب کی کنیت ابو تیم یا ابوتمیم تھی، ان کے ہاں تین بیٹے پیدا ہوئے، ایک کا نام لوی بن غالب تھا...... یہی آنحضور ﷺ کے جدامجد ہیں۔ دوسرے کا نام تیم بن غالب اور تیسرے بیٹے کا نام قیس بن غالب تھا، جب کہ ان کی والدہ سلمیٰ بنت عمرو بن ربیعہ الخراعیہ تھیں...... تیم بن غالب کو ''بنوالادرم'' کہا جاتا ہے۔ الادرم کے معنی ناقص ٹھوڑی والے کے ہیں۔ ابن حزم نے ان کا نام تمیم لکھا ہے۔ (۷۱) دوسرے قول کی رو سے ان کی والدہ کا نام عاتکہ بنت یخلد بن النضر بن کنانہ تھا (۷۲)۔ جناب غالب بھی بہت سی خصوصیات اور صفات کے حامل تھے...... شیخ ابوالعباس عبداللہ ان کی بابت فرماتے ہیں۔

جیسا کہ ہم سابق اوراق میں ذکر کر آئے ہیں اس بارے میں اور بھی کئی اقوال ہیں۔

وہ بڑی صلاحیتوں والے اور عمدہ خطابت والے بزرگ تھے، جیسا کہ شیخ ابوالعباس عبداللہ ان کے متعلق کہتے ہیں:

و کانت لفهر في قريش خطابة   يعوذ بها عند اشتجار المخاطب (٦٩)

(''قریش'' میں فہر کو ولایت کا درجہ حاصل تھا، مخاطب کے پریشان ہونے کے وقت ان کی پناہ لی جاتی تھی).

جناب فہر کے ہاں پانچ اولادیں ہوئیں، چار بیٹے: غالب بن فہر، محارب بن فہر، الحارث بن فہر اور اسد بن فہر اور ایک بیٹی جندلہ...... جوریبوع بنت حنظلہ بن مالک بن زید بن مناۃ بن تمیم کی والدہ ہیں...... ان سب کی ماں لیلیٰ بنت سعد بن ھذیل بن مدرکہ تھیں...... جریر بن عطیہ الخطفی اپنے ایک قصیدے میں ان کے متعلق کہتا ہے:

واذا غضبت رمى ورائى بالحصىٰ   ابناء جندلة كخير الجندل (٧٠)

(اور جب میں غضبناک ہوتا ہوں، تو میرے پیچھے ''جندلہ'' کے بیٹے جندل کی طرح کنکریاں مارتے ہیں).

(۱۲) غالب بن فہر

جناب غالب کی کنیت ابو تیم یا ابو تمیم تھی، ان کے ہاں تین بیٹے پیدا ہوئے، ایک کا نام لؤی بن غالب تھا...... یہی آنحضور ﷺ کے جد امجد ہیں۔ دوسرے کا نام تیم بن غالب اور تیسرے بیٹے کا نام قیس بن غالب تھا، جب کہ ان کی والدہ سلمٰی بنت عمرو بن ربیعہ الخزاعیہ تھیں...... تیم بن غالب کو ''بنو الادرم'' کہا جاتا ہے۔ الادرم کے معنی ناقص ٹھوڑی والے کے ہیں۔ ابن حزم نے ان کا نام تمیم لکھا ہے۔ (۷۱) دوسرے قول کی رو سے ان کی والدہ کا نام عاتکہ بنت یخلد بن النضر بن کنانہ تھا (۷۲)۔ جناب غالب بھی بہت سی خصوصیات اور صفات کے حامل تھے...... شیخ ابوالعباس عبداللہ ان کی بابت فرماتے ہیں۔

وفي غالب باس ابی الباس دونهم　　يدافع عنهم كل قرن مغالب(۷۳)

(یعنی اور غالب (بن فہر) میں وہ زور تھا کہ اس (زور و طاقت) نے ان کے علاوہ کسی اور میں ہونے سے انکار کر دیا۔ وہ (زور) ہر غالب قوم سے، ان کی حفاظت کرتا تھا)۔

(۱۴) جناب لؤی بن غالب

جناب غالب کے صاحبزادے لؤی بن غالب تھے،......ان کی کنیت ابو غالب تھی۔ ان کے ہاں درج ذیل چار بیٹے پیدا ہوئے: کعب بن لؤی، عامر بن لؤی، سامہ بن لؤی اور عوف بن لؤی...... ان میں سے تین، یعنی کعب بن لؤی، عامر بن لؤی اور سامہ بن لؤی کی والدہ ماویہ بنت کعب بن القین (النعمان) بن قضاعیہ تھیں، جو بنو قضاعہ سے تعلق رکھتی تھیں، جناب ماویہ کی والدہ کا نام عاتکہ بنت کاھل بن غدرہ تھا۔(۷۴)

ایک اور قول کی رو سے، جناب لؤی کے پانچویں بیٹے کا نام ''الحارث بن لؤی'' تھا، جن سے بنو جشم بن الحارث کا خاندان پیدا ہوا۔ یہ لوگ ربیعہ کے قبیلہ ہِزّ ان میں شمار ہوتے تھے۔

یہ دور چونکہ نبی اکرم ﷺ کے اجداد کی تاریخ میں صحرانوردی کا دور تھا، اس لیے جناب لؤی کے خاندان کے کچھ لوگ دوسرے قبیلوں سے مل گئے۔ چنانچہ حارث بن لؤی کے خاندان کے بارے میں جریر کہتا ہے:

بنی جشم لستم لهزان فانتموا لا علي الروابي من لؤی ابن غالب ولا تنكحوا
في ال صورنساء كم ولا في شكيس ئبس. مثوى الغرائب

اے خاندان جشم تم ہزان میں سے نہیں ہو، لہٰذا اس سے اوپر لؤی بن غالب سے خود کو منسوب کرو۔ اور خاندان صور میں اپنی عورتوں کو نہ بیاہو۔ اور نہ ہی شکیس میں۔

جس کے بعد انہوں نے خود کو قریش میں شامل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس شعر

پر انہوں نے جریر کو ایک ہزار اونٹ بطور تحفہ دیئے۔

اسی طرح جناب لؤی کے چھٹے بیٹے کا نام سعد بن لؤی تھا، جن کی اولاد ''شیبان بن ثعلبہ بن عکابہ بن صعب'' کا بنو بنانہ ہیں۔(۷۵)

السہیلی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ لوگ اپنی ایک دودھ پلائی (حاضنہ) کی نسبت سے معروف ہیں، جس کا نام ''بنانہ'' تھا جو بنو ضبیعہ (ضبیعہ اضجم بن ربیعہ، نہ کہ ضبیعہ بن اقیس بن ثعلبہ) سے تعلق رکھتی تھیں، اور پھر اسی کے پاس چلے گئے۔(۷۶)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت (۱۳ھ - ۲۴ھ) میں یہ لوگ اپنے سردار (ابو الدھماء) کی سربراہی میں مدینہ طیبہ آئے اور اس بات کی خواہش کی کہ انہیں بھی قریش میں شامل تصور کیا جائے، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے انکار کر دیا، لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے والد جناب عفان کے حوالے سے بتایا کہ قریش سے ان کا نسب صحیح ہے.... تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ سال آئیں، تو وہ انہیں قریش کے ساتھ شامل کر لیں گے، لیکن اس دوران میں ابو الدھماء قتل ہو گئے اور باقی لوگ اپنے اپنے کاموں میں جا کر مصروف ہو گئے اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت ہو گئی، تاہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں انہیں قریش میں شامل کر لیا، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں انہیں قریش سے نکال دیا اور بنو شیبان میں شامل کر دیا...... اس پر ایک شاعر نے کہا:

ضرب التجيبي المضلل ضربةً ردت بنانه في بني شيباناً(۷۷)

(التجیبی (کنانہ بن بشیر التجیبی، قاتل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) نے تلوار کا ایک ایسا ہاتھ مارا جس نے بنو کنانہ کو بنو شیبان میں لوٹا دیا)۔

جناب لؤی کے ساتویں بیٹے کے نام خزیمہ بن لؤی تھا۔ ان کی اولاد اپنی والدہ عائذہ (بنو عائذہ) کے نام سے معروف ہوئی، یہ خاتون عبیدہ بن خزیمہ کی بیوی تھی اور ان سے ان کے دو بیٹے مالک اور حارث پیدا ہوئے، یہی لوگ بنو خزیمہ یا بنو عائذہ ہیں۔ انہی کا ایک خاندان بنو حرب بن خزیمہ تھا، جو شام میں رہائش پذیر تھا، انہیں عباسی تحریک کے دوران میں ''بنو حرب بن امیہ'' سمجھ کر مار ڈالا گیا۔(۷۸)

جناب لؤی کے ایک صاحب زادے سامہ بن لؤی تھے...... وہ "عمان" چلے گئے تھے اور وہیں انہوں نے انتقال کیا۔ ان کے ترک وطن کرنے کی وجہ نسب دانوں نے یہ لکھی ہے کہ ایک مرتبہ ان میں اور ان کے بڑے بھائی عامر کے مابین جھگڑا ہو گیا۔ سامہ نے "عامر" کی آنکھ پھوڑ دی، اب "عامر" نے انہیں دھمکایا، کہ وہ بدلہ لیں گے جس پر وہ وہاں سے نقل مکانی کر کے یمن چلے گئے اور وہیں انہوں نے سانپ کے ڈسنے سے انتقال کیا۔ (۷۹)

انہوں نے مرنے سے پہلے اپنا مرثیہ خود لکھا (دیکھئے ابن سعد: ۱/ ۹۸)

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میں سامہ بن لؤی کی اولاد میں سے ہوں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا جو شاعر تھا؟ کہا ہاں۔ (۸۰)

علامہ السہیلی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض نسب دانوں کے حوالے سے روایت کی ہے کہ سامہ لاولد فوت ہوئے۔ البتہ انہوں نے ایک شخص کو اپنا متبنّی (لے پالک) بنا لیا تھا، غالبًا مذکورہ شخص اس کی اولاد میں سے تھا...... (۸۱) لیکن نامور مؤرخ اور نسب دان زبیر بن بکار کہتے ہیں کہ ان کے تین بیٹے تھے: غالب، المنیت، اور غطفان الحارث...... ان کے بقول اس خاندان کے لوگ عراق میں مقیم تھے۔ (۸۲)

جناب لؤی کے صاحبزادے عوف بن لؤی کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا ماجرا گزرا، وہ قریش کے ایک قافلے کے ہمراہ جا رہے تھے، جب وہ غطفان بن سعد بن قیس بن عیلان کے علاقے میں پہنچے، تو انہوں نے روانگی میں اتنی دیر کر دی کہ ان کے ہمراہی چلے گئے اور وہ وہیں رہ گئے...... اس پر ثعلبہ بن سعد نے جو "بنو ذبیان" سے نسب میں ان کا بھائی تھا، انہیں قید کر لیا اور پھر ان کی اپنے قبیلے میں شادی کر دی اور انہیں اپنا بھائی بنا لیا، اس طرح ان کا خاندان بنو ذبیان میں شامل ہو گیا...... (۸۳) واللہ اعلم......

نامور سیرت نگار ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ان کا ایک وفد "مدینہ منورہ" میں آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا، کہ

اگر تم اپنے صحیح نسب (خاندان) لوٹنا چاہو، تو تم ایسا کر سکتے ہو، ان لوگوں کے متعلق یہ بھی نقل کیا جاتا ہے کہ ان میں ''البسل'' نامی رسم تھی، جس کے تحت یہ لوگ سال کے آٹھ مہینوں کو اشھر حرم (حرمت والے مہینے) قرار دیتے تھے۔ (۸۴)

ابن ہشام نے عبدالرحمان بن عبداللہ بن حصین کے حوالے سے یہ نقل کیا ہے، کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر عرب کا کوئی قبیلہ ہم سے الحاق کا دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ بنو مرہ بن عوف ہیں۔ (۸۵)

(۱۴) جناب کعب بن لؤی

جیسا کہ اوپر گزرا، جناب لؤی کے تمام بیٹوں میں جناب کعب بن لؤی سب سے بڑے اور سب سے زیادہ سمجھدار تھے۔ ان کی کنیت ابو ھُصیص تھی۔ کعب کے لغوی معنی رفعت و بلندی اور عظمت و شرف کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نام ہی کی طرح عظمت و بلندی عطا فرمائی تھی۔ وہ اپنے زمانے میں اس حد تک معروف تھے کہ ان کی وفات کے بعد لوگوں نے اس تاریخ سے تاریخ کا شمار شروع کر دیا۔ جس تاریخ کو وہ فوت ہوئے تھے جو عام الفیل تک جاری رہا۔

انہوں نے مخشیہ بنت شیبان بن محارب بن فہر سے نکاح کیا، جس سے تین بیٹے پیدا ہوئے، یعنی مرہ بن کعب، عدی بن کعب، اور ھصیص بن کعب۔ حضرت مخشیہ کی والدہ کا نام وحشیہ بنت وائل تھا۔ شیخ ابو العباس عبداللہ ان کے متعلق فرماتے ہیں:

و کعب علا عن طالب المجد کعبه　　فنال بادنی السعی اعلی المراتب (۷۰)

(یعنی کعب کا ٹخنا بڑائی کے ہر طالب سے اونچا ہے، انہوں نے ادنی سی کوشش سے اعلیٰ مراتب حاصل کر لیے)۔

(۱۵) مرہ بن کعب

مُرّہ کے لغوی معنی تلخ کے ہیں، ان کی کنیت ابو یقظہ تھی۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ کا نسب نامہ ساتویں پشت میں حضرت مرہ بن کعب پر جا کر نبی اکرم ﷺ کے ساتھ جا کر مل جاتا ہے۔

جناب مرہ بن کعب اپنے بھائیوں میں سب سے زیادہ سمجھ بوجھ اور عقل والے بزرگ تھے..... انہوں نے دو نکاح فرمائے، پہلا نکاح ''ہند'' بنت سریر بن ثعلبہ بن الحارث بن فہر...... سے کیا، جن سے جناب ''کلاب بن مرہ'' پیدا ہوئے، جو نبی اکرم ﷺ کے اجداد میں سے ہیں ..... دوسرا نکاح اسماء بنت سعد بن عدی بن حارثہ البارقیہ سے کیا، جن کا تعلق یمن کے بنو اسد کے خاندان بنو بارقہ سے تھا جو قبیلہ ازد کا ایک بطن (شاخ) تھا۔ ان سے جناب یقظہ..... کی ولادت ہوئی۔ ان کی تیسری اولاد تیم بن مرہ ہیں۔ جن کی والدہ ایک قول کی رو سے ھند اور دوسرے کی رو سے ''البارقیہ'' ہیں (۸۷)

ابن سعد کے مطابق ھند (والدہ، کلاب) کی والدہ امامہ بنت عبد مناۃ بن کنانہ اور پڑنانی ھند بنت دودان تھیں. (۸۸) ان کے متعلق شیخ ابو العباس لکھتے ہیں:

ومرة لم یحلل مریرہ عزمه

سفاہ سفیهٍ او محوبة خائب

(۱۶) جناب کلاب بن مرہ

جناب مرہ کی اولاد میں کلاب بن مرہ.....کو خصوصی امتیاز اور تفوق حاصل تھا۔ ان کی بیوی (اور ان کے دونوں صاحب زادوں کی والدہ) کا نام فاطمہ بنت سعد بن سیل تھا، جو بنو ازد کے خاندان بنو جفنہ سے تعلق رکھتی تھیں..... (۸۹) سیل کا نام خیر بن حمالہ بن عوف بن عامر الجادر تھا اور یہ پہلا شخص تھا، جن کی تلوار کو سونے اور چاندی سے صیقل کیا گیا...... (۹۰) ......ان کے پڑدادا کا نام عامر الجادر تھا اور وہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے کعبہ کی (غالباً بیرونی) دیوار بنائی، اس لیے انہیں ''الجادر (از جدار)'' کہا جاتا ہے. (۹۱)

ان کا اصلی نام حکیم یا مہذب یا عروہ تھا۔ ان کی کنیت ابوالمغیرہ تھی۔ کلاب کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ کلاب ''مکالبہ'' کے معنوں میں مصدر ہے، جس کے

معنی دشمن پر بہادری کے ساتھ حملہ کرنے یا جھپٹنے کے ہیں۔

ان کے ہاں دو بیٹے پیدا ہوئے، جن میں سے ایک کا نام "قصی بن کلاب اور دوسرے کا زہرہ بن کلاب ہے۔ ان کی ایک صاحبزادی بھی تھیں، جن کا نام نعم بنت کلاب تھا، یہی خاتون سہم بن عمرو بن ھصیص بن کعب بن لؤی کی بیوی اور ان کے دو بیٹوں سعد اور سعید کی والدہ تھیں۔ (۹۲)

جناب کلاب بن مرہ بڑی شان وشوکت اور عظمت رکھنے والے بزرگ تھے۔ شیخ ابوالعباس عبداللہ ان کے متعلق فرماتے ہیں:

وحل کلاب من ذری المجد معقلاً تقاصر عنه کل دان و غائب.

(اور کلاب بزرگی کی ایسی چوٹی پر پہنچے کہ اس سے ہر نزدیک اور دور والا شخص قاصر رہا۔)

جناب کلاب پر نبی اکرم ﷺ کے دونوں نسب نامے یعنی والدہ کی طرف سے اور والد بزرگوار کی طرف سے ایک ہو جاتے ہیں۔ جناب عبداللہ قصی بن کلاب کی اولاد ہیں اور حضرت آمنہ جناب زہرہ بن کلاب کی نسل میں سے ہیں۔

جناب کلاب بن مرہ پر وہ دور اختتام پذیر ہو جاتا ہے، جو حضرت اسماعیل کے پوتوں (اولاد نابت وقیدار) کے زمانے سے شروع ہوا تھا، یعنی کعبہ معلّٰی کی تولیت اور مکہ معظّمہ کی حکومت سے بے دخلی ...... کا دور۔ جناب کلاب کے فرزند جناب قصی بن کلاب نے محض اپنے فہم وفراست سے اپنے خاندان کی کھوئی ہوئی عظمت اور وقار کو دوبارہ حاصل کیا اور اس طرح مکہ معظّمہ میں ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی۔ جس کا تذکرہ آئندہ اوراق میں آرہا ہے۔

حوالہ جات وحواشی

(۱) ابن کثیر، البدایہ،۱۸۵/۲.

(۲) البدایہ،۱۸۵/۲.

(۳) السھیلی، الروض الانف ،۶۵/۱، بحوالہ الطبری.

(۴) ابن ہشام، السیرۃ،۷۲/۱.

(۵) البدایہ،۱۸۵/۲۔ ارمیاء بن حلقیاء کے متعلق عبدالرحمان الوکیل (حاشیہ نگار السہیلی، ۶۸/۱) نے لکھا ہے کہ وہ عبرانیوں کے نبی تھے اور انہیں اللہ تعالیٰ نے بہت کم عمری میں مرتبہ نبوت پر فائز کر دیا تھا۔ اسی بنا پر لوگوں نے پہلے ان کی نبوت کا انکار کیا، مگر بعد ازاں لوگوں نے ان کی نبوت کو تسلیم کر لیا۔ اور یہ کہ ان کی نبوت ۴۶ سالوں پر محیط تھی.

(۶) ایضاً،۱۸۳/۲، ۱۹۵.

(۷) السہیلی، الروض الانف،۶۸/۱.

(۸) الطبری،۲۸۰/۱، مطبع الحسینیہ، ص ۲۹۲،۹۰.

(۹) ایضاً.

(۱۰) السہیلی، ۶۹/۱.

(۱۱) السہیلی، ۷۰/۱، الطبری، تاریخ،۱۹۴/۲.

(۱۲) ابن سعد،۴۶/۱.

(۱۳) الطبری ۲۹۲/۱..... لیکن جیسا کہ عبدالرحمان الوکیل (حاشیہ نگار السہیلی، ۶۹/۱، عد) وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ روایت بجائے خود محل نظر ہے، اس کی اصل کا پتہ نہیں ہے.

(۱۴) السہیلی، ۶۹/۱.

(۱۵) ابن سعد، ۶۶/۱، ابن سعد نے جوشن کی جگہ جوشم لکھا ہے.

(۱۶) ابن کثیر، ۱۹۷/۲.

(۱۶۔الف) جمہرۃ انساب العرب، ص: ۶۰۔۶۱

(۱۷) السہیلی، ۶۳/۱-۶۴ ...... بقول عبدالرحمان الوکیل اس طرح کی تمام روایات بلا سند اور بلاحوالہ ہیں.

(۱۸) عبدالرحمان، الوکیل، حواشی السہیلی، ۶۴/۱، عددا.

(۱۹) ابن کثیر، ۱۹۷/۲.

(۲۰) ایضاً، ۱۹۹/۲، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ، جناب نزار کی دونوں بیویاں باہم بہنیں تھیں، جن سے انہوں نے یکے بعد دیگرے نکاح کیا ہوگا...... یا پھر اس وقت کی شریعت میں دو بہنوں سے بیک وقت نکاح جائز ہوگا.

(۲۱) الکامل لابن الاثیر، ۱۱/۲، حدی خوانی سے مراد ایسے اشعار پڑھنا ہے، جو اونٹوں کو تیز چلانے کے لیے پڑھے جاتے ہیں. بعدازاں یہ ادب کی ایک خاص صنف بن گئی.

(۲۲) البدایہ، ۱۹۹/۲.

(۲۳) ابن منظور الافریقی: لسان العرب، ۱۶۲/۱۳، مطبوعہ دارالتراث العربی، بیروت.

(۲۴) السہیلی، ۶۲/۱؛ ابن سعد، ۳۸/۱.

(۲۵) البدایہ، ۱۶۷/۲

(۲۶) عبدالرحمان ابن الجوزی کی کتاب الاذکیاء اردو ترجمہ اشتیاق احمد، دارالاشاعت کراچی، ص ۱۲۵-۱۲۸.

(۲۷) السہیلی، ۵۷/۱.

(۲۸) ایضاً ۵۷/۱، یعنی وہ دل کی گھبراہٹ سے بہادر اور سخی ہے۔ عبدالرحمٰن الوکیل، حواشی، ۵۸/۱ عددا.

(۲۹) ابن سعد، الطبقات، ۶۵/۱، یہ روایت اس لیے درست معلوم نہیں ہوتی کہ نام زندگی میں رکھا جاتا ہے، مرنے کے بعد نہیں اور اگر کسی شخص کو مرنے کے بعد کوئی نام دیا جائے، تو

وہ اس کے لیے اتنی شہرت نہیں رکھتا۔ علاوہ ازیں بیماریوں سے، لوگوں کے نام رکھنا کسی جگہ بھی متداول نہیں ہے...... واللہ اعلم.

(۳۰) السہیلی، ۶۱/۱..... السہیلی کے حاشیہ نگار (عبدالرحمان الوکیل) نے، اس پر یہ تبصرہ نقل کیا ہے کہ "البرہان الزرکشی" کہتے ہیں کہ مجھے اس حدیث کا حال معلوم نہیں ہے، اور جامع الصغیر میں ہے، "اس روایت کو ابن سعد نے عبداللہ بن خالد سے مرسلاً روایت کیا ہے اور وہ ضعیف ہے۔

(۳۱) البدایہ، ۱۹۷/۲.

(۳۲) البدایہ، ۱۹۷/۲.

(۳۳) ابن سعد، ۴۵/۱.

(۳۴) السہیلی، ۵۷/۱.

(۳۵) البدایہ، ۱۹۹/۱.

(۳۶) ایضاً، ۱۹۷/۱.

(۳۷) علامہ السہیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ "خزمہ" کی تصغیر ہے، جو الخزام" کا واحد ہے اور" الخزام، اس پودے کو کہتے ہیں، جس کی چھال سے رسی بائی جاتی ہے (غالباً سن)؛ السہیلی، ۵۶/۱.

(۳۸) ابن سعد، ۴۵/۱.

(۳۹) البدایہ، ۱۹۷/۲.

(۴۰) السہیلی، ۳۸۴/۱.

(۴۱) عبدالرحمان، الوکیل، حواشی الروض الانف للسھیلی: ۵۶/۱، عددا.

(۴۲) ابن سعد، ۴۵/۱.

(۴۳) ابن ہشام: ۹۲/۱، المکتبۃ العلمیہ، بیروت۔

(۴۴) ابن کثیر، ۱۹۷/۲.

(۴۵) السہیلی، ۵۶/۱

(۴۵) الف۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ: ۱/۱، حاشیہ۔۳

(۴۶) ابن سعد، ۱/۴۵۔

(۴۷) ابن کثیر، ۲/۱۹۹-۲۲۰، ابن کثیر نے یہاں دو اقوال نقل کیے ہیں، ایک یہ کہ: حضرت ''نضر بن کنانہ'' کی والدہ برہ بنت مرہ تھیں اور دوسرے بھائی دوسری والدہ سے تھے، جبکہ ابن ہشام کے مطابق جناب برہ نضر، مالک اور ملکان کی اور ہالہ بنت سوید عبد مناۃ کی والدہ تھیں (ابن ہشام، ۱/۳۸۵)۔

(۴۸) ابن ہشام، ۱/۳۳۴۔

(۴۸) (الف) ابن ہشام، السیرۃ، ۱/۳۸۴-۳۸۵۔

(۴۹) ایضاً، ۱/۳۸۵۔

(۵۰) البدایہ، ۲/۲۰۱۔

(۵۱) البدایہ، ۲/۲۰۱، ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس روایت کو ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے، لہٰذا جو لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

(۵۲) ابن کثیر، ۱/۲۰۰-۲۰۱، مگر ابن کثیر کے مطابق یہ روایت ضعیف ہے اور اس کا راوی الکلبی ہے، جو ضعیف ہے۔

(۵۳) ابن ہشام، ۱/۳۸۵۔

(۵۴) السہیلی، ۱/۳۹۵۔

(۵۵) ابن کثیر، ۲/۲۰۰۔

(۵۶) البدایہ، ۲/۲۰۰۔

(۵۷) الروض الانف، ۱/۳۸۶۔

(۵۸) ابن کثیر، ۲/۲۰۰۔

(۵۹) ابن ہشام، السیرۃ، ۱/۳۸۶۔

(۶۰) ابن کثیر، البدایہ، ۲/۲۰۱؛ والسہیلی، الروض الانف، ۱/۳۸۶۔

(۶۱) ابن ہشام، السیرۃ، ۱/۳۸۵۔

(۶۲) ایضاً، ۲/۲۰۲-۲۰۳۔

(۶۳) البدایہ، ۲/۱۹۷۔

(۶۴) ابن سعد، ۱/۴۵۔ ابن ہشام (۱/۳۸۶) نے ان کی والدہ کا نام عاتکہ بنت عدوان لکھا ہے۔

(۶۵) ابن ہشام، السیرۃ، ۱/۳۸۶۔

(۶۶) البدایہ، ۲/۱۹۷۔

(۶۷) ابن ہشام، ۱/۳۸۷۔ ابن ہشام نے صراحت سے لکھا ہے کہ وہ "مضاض الجرہمی کی پوتی تھیں، نہ کہ مضاض الاکبر" کی، جبکہ ابن کثیر نے انہیں مؤخر الذکر کی پوتی قرار دیا ہے۔

(۶۸) البدایہ، ۲/۲۰۰؛ ابن سعد، ۱/۴۵

(۶۸) (الف) مصعب الزبیری، کتاب نسب قریش، ص ۱۲

(۶۹) البدایہ، ۲/۱۹۷۔

(۷۰) ابن ہشام، ۱/۳۸۷۔

(۷۱) ابن ہشام، السیرۃ، ۱/۳۸۷، الادرم سے مراد وہ لوگ ہیں، جن کے ٹخنے گوشت میں ڈھانپے ہوئے ہوں: السہیلی، ۱/۲۰۰۔

(۷۲) ابن سعد، ۱/۴۵...... ابن سعد کے مطابق یہ قول متفق علیہ ہے، نیز دیکھئے البلاذری، انساب الاشراف، ۱/۴۰

(۷۳) ابن کثیر، البدایہ، ۲/۱۹۷۔

(۷۴) ابن سعد، الطبقات، ۱/۶۷، علامہ السہیلی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ماویہ کا لفظ "ماء" سے بنا ہے، اور ماویہ کا ماء (پانی) سے انتساب ان کی پاکیزگی کی بنا پر تھا۔

(۷۵) ابن سعد: ۶۵، ابن ہشام: ۱/۹۵-۹۶

(۷۶) السہیلی، ۱/۴۰۳۔

(۷۷) السہیلی، ۱/۴۰۲-۴۰۳۔

(۷۸) ابن ہشام، ۱/۳۸۸..... یہ خاتون (عائذہ) جس کی نسبت سے انہیں شہرت حاصل ہوئی، یمن کی رہنے والی تھی، وہ الخمس بن قحافہ خثعمی کی صاحبزادی تھیں...... السہیلی، ۱/۴۰۵۔

(۷۹) ابن ہشام، ۱/۳۸۹۔

(۸۰) ابن کثیر، ۱/۲۰۳۔

(۸۱) السہیلی، ۱/۴۰۷

(۸۲) ابن کثیر، ۲/۲۴، ان کی بابت علامہ السہیلی نے لکھا ہے کہ یہ لوگ عراق میں مقیم تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سخت مخالف تھے۔ ان میں علی بن الجہم الشاعر بھی تھا، جو اس بنا پر اپنے والد پر لعنت کرتا اور اسے برا بھلا کہتا تھا، کہ اس نے اس کا نام علی رکھا تھا (السہیلی، ۱/۴۰۷)، امام محمد بن اسماعیل البخاری رحمہ اللہ کے ایک استاد محمد بن عرعرہ بن الیزید کا نسبی تعلق بھی اسی خاندان سے تھا.

(۸۳) السہیلی، ۱/۴۱۰-۴۱۱.

(۸۴) ابن ہشام، السیرۃ، ۱/۴۱۴.

(۸۵) ابن ہشام، ۱/۴۱۱.

(۸۶) ایضاً، ۱/۴۱۴ ابن سعد نے ان کی بیوی کا نام مخشیہ بنت شیبان بن محارب بن فہر لکھا ہے اور کہا ہے کہ وہ وحشیہ بنت وائل بن قاسط کی بیٹی، جبکہ وحشیہ ماویہ بنت صبیعہ بن ربیعہ بن نزار کی صاحبزادی تھیں (ابن سعد، ۱/۶۴-۶۵)

(۸۷) ابن کثیر، البدایہ، ۲/۱۹۶.

(۸۸) ابن ہشام، السیرۃ، ۱/۴۱۵.

(۸۹) ابن سعد، ۱/۶۶.

(۹۰) ابن کثیر، البدایہ، ۲/۲۰۵.

(۹۱) ابن سعد، ۱/۴۶۱.

(۹۲) ابن ہشام، ۱/۴۶۱.

بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِہٖ
کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ
حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ
صَلُّوْا عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ

باب 7

دورِ عروج واقتدار

(جناب قصی سے...... جناب عبداللہ تک)

(۱) جناب قصی بن کلاب

جناب قصی بن کلاب نبی اکرم ﷺ کے پانچویں ''جد امجد'' ہیں۔ ان کا زمانہ آنحضور ﷺ کے زمانہ اقدس سے ۲۰۰ تا ۳۰۰ سال پہلے ہے(۱)۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضور ﷺ کے جن اجداد کے ذریعے مکہ مکرمہ میں سیاسی اور معاشرتی تبدیلیاں پیدا فرمائیں، ان میں جناب قصی بن کلاب کا نام سب سے زیادہ روشن اور سب سے اہم ہے۔ ان کی بدولت مکہ مکرمہ میں خاندان ابراہیم و اسماعیل کا دور اقتدار پھر لوٹ آیا اور انہوں نے اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام و اسماعیل کے وارث حقیقی کی پیدائش اور اشاعت دین کی راہ ہموار ہوئی۔

(1) جناب قصی کے ابتدائی حالات:

جناب قصی کی ننھیال یعنی جناب ''سعد بن سیل کے خاندان نے، جو خثعمہ کہلاتا تھا اور بنو ازد سے تعلق رکھتا تھا، مآرب (یمن) سے، اپنے قبیلے بنو ازد کے ہمراہ نقل مکانی کر کے ایک مکی خاندان الدیل بن بکر بن عبد مناۃ بن کنانہ'' کے ہاں آ کر قیام کیا اور ان سے دوستی اور حلف کا تعلق کر لیا، یہ تعلق اتنا بڑھا کہ انہوں نے ان سے رشتہ داریاں قائم کر لیں۔ اس بنا پر جناب قصی کی والدہ فاطمہ بنت سعد ''بن سیل (خیر) بن حمالہ بن عوف بن عامر کے لیے جناب کلاب کی طرف سے نکاح کا پیغام قبول کر لیا گیا۔ اس طرح ان کی کلاب بن مرّہ (والد قصی) سے شادی ہو گئی۔

یہ تعلق بڑا مبارک ثابت ہوا۔اس کے ذریعے عرب کا ایک قدیم خاندان (بنو ازد) کا بیرون عرب سے آنے والے خاندان (بنو اسماعیل) سے ملاپ ہو گیا،جس سے خاندان'' کلاب بن مرہ کو ایک نئی زندگی ملی۔اس نکاح سے ان کے ہاں زہرہ اور زید (قصی) دو بیٹے اور ایک بیٹی نعم کی ولادت ہوئی...... قصی کا نام زید رکھا گیا.

شومیٔ قسمت سے، زید (قصی) ابھی شیر خوار ہی تھے کہ ان کے والد محترم جناب کلاب بن مرہ کی وفات ہو گئی۔اس پر ان کی بیوی (قصی کی والدہ فاطمہ) نے ربیعہ بن ضنہ بن عبد بن کبیر...... القضاعی سے نکاح کر لیا۔(ابن ہشام کے مطابق ربیعہ بن حرام حضرت قصی کے سوتیلے والد کا تعلق عذرہ بن سعد بن زید سے تھا)۔اس وقت جناب زہرہ تو بڑے تھے (یہ زہرہ نبی اکرم ﷺ کی والدہ جناب آمنہ کے جد امجد ہیں)،اس لیے وہ اپنی ددھیال کے ساتھ (مکہ) ہی میں رہے، البتہ ننھے زید (جو بعد میں قصی کہلائے)،اپنی والدہ کے ہمراہ بنو عذرہ کے علاقے میں چلے گئے۔جو کہ شام کے علاقہ سرغ اور اس سے آگے آباد تھے۔(۲) وطن سے دوری کی بنا پر ننھے زید کا نام قصی (پڑوسی) پڑ گیا۔اسی دوران میں ربیعہ سے ان کا ایک بھائی رزاح پیدا ہوا۔(۳) بچپن میں قصی کو''ربیعہ بن حرام'' کے گھر میں پرورش پانے کی بنا پر،انہیں سے منسوب کیا جاتا تھا،لیکن ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ بنو قضاعہ کے ایک شخص رفیع کا نوجوان زید (قصی) سے تیر اندازی میں مقابلہ ہو گیا، جسے مؤخر الذکر نے جیت لیا،اس پر ان کے اور رفیع کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔اس جھگڑے کے دوران میں''رفیع'' نے نوجوان قصی کو بے وطنی کا طعنہ دیتے ہوئے کہا:

اگر تو اتنا ہی سورما ہے تو اپنی قوم کے پاس کیوں نہیں چلا جاتا اس لیے کہ تو ہمارے قبیلے کا فرد نہیں ہے''.

اس پر نوجوان قصی اپنی والدہ کے پاس آیا اور کہا، بتایئے میرا باپ کون ہے؟ وہ بولیں ربیعہ! مگر نوجوان قصی نے کہا،اگر میں ان کا بیٹا ہوتا،تو پھر'' مجھے بے قومی کا طعنہ کیوں ملتا'' وہ بولیں،کیا کسی نے ایسی بات کہہ دی ہے؟ بخدا اے میرے بیٹے تو اپنی ذات،اپنے والد،اپنے نسب اور اپنے مقام کی بنا پر اس طعنہ دینے والے سے

زیادہ معزز ہے۔ تیرا باپ کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی...... القرشی ہے، اور تیری قوم بیت اللہ شریف کے آس پاس مقیم ہے...... اس پر قصی نے کہا، بخدا اب میں یہاں بالکل نہیں ٹھہروں گا...... ان کی والدہ نے کہا بیٹا، تم اس وقت تک یہاں ٹھہرو جب تک حج کا موسم نہیں آ جاتا، حج کے دنوں میں تم بے شک حجاج کے ساتھ چلے جانا، اس لیے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہیں لوگ نقصان نہ پہنچائیں۔

چنانچہ جب حج کا موسم آیا، تو جناب قصی بنو قضاعہ کے ہمراہ مکہ معظمہ چلے گئے۔ اس وقت ان کے بڑے بھائی ''زہرہ بن کلاب بن مرہ'' زندہ تھے، جو بڑے شاعر تھے۔ جب قصی اپنے بھائی زہرہ کے پاس گئے اور کہا میں تیرا بھائی ہوں! اس وقت جناب زہرہ کی بینائی جاتی رہی تھی، لہٰذا انہوں نے کہا تم میرے پاس آؤ، میں تمہیں ٹٹول کر دیکھوں گا کہ آیا تو واقعی میرا بھائی ہے یا نہیں، چنانچہ انہوں نے جب اپنے بھائی کو ہاتھوں سے چھو کر دیکھا، تو کہا بخدا میں تمہاری آواز اور جسمانی مشابہت ایسی ہی پاتا ہوں کہ تو میرا بھائی ہے۔ پھر جب قصی حج سے فارغ ہوئے، تو بنو قضاعہ نے انہیں اپنے ہمراہ واپس لے جانا چاہا، مگر انہوں نے واپس جانے سے انکار کر دیا اور مکہ مکرمہ میں مقیم ہو گئے۔

نوجوان قصی نے بنو قضاعہ کے ساتھ کھلی آب و ہوا میں پرورش پائی تھی، اس لیے وہ جسمانی طور پر بہت عمدہ قد و قامت کے مالک تھے۔ انہوں نے ''بنوخزاعہ'' کے سردار مکہ مکرمہ کے حاکم اعلیٰ اور بیت اللہ شریف کے متولی حلیل بن حبشیہ بن سلول کی بیٹی حبی کے لیے پیغام دیا، جسے حلیل نے قبول کر لیا اس لیے جناب قصی بنو خزاعہ کے داماد بن گئے۔ (۴)

یہاں تک کہ حالات پر تو تمام سوانح نگار اور مؤرخین متفق ہیں، اس کے بعد کے واقعات کے متعلق کئی روایات ہیں۔

ابن سعد نے السائب الکلبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ حلیل کے بعد، جب بیت اللہ شریف کا انتظام اس کے بیٹے المحترش ابوغبشان کے سپرد ہوا...... تو کچھ عرب قبیلوں نے، اپنے وہ سالانہ عطیے روک لیے، جو اس کے والد حلیل کو دیا

کرتے تھے، اس پر اسے بڑا غصہ آیا، جناب قصی نے، جوان دنوں صاحب اولاد اور صاحب جائیداد بھی تھے، اسے بلا بھیجا، وہ آیا تو اسے پہلے شراب پلائی اور پھر اس سے تھوڑے سے غلے یا شراب کے مٹکے کے عوض "بیت اللہ شریف" کے حقوق تولیت خرید لیے (یا اس کی چابیاں حاصل کرلیں)۔ اس طرح بڑی خاموشی سے یہ تبدیلی واقع ہوگئی اور وہ بیرون مکہ چلا گیا۔ (۵)

ابن سعد نے ہی فاطمۃ الخزاعیہ کے حوالے سے، جنھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کا زمانہ پایا تھا، یہ بیان کیا ہے:

جناب قصی نے حُبّی بنت حلیل سے نکاح کیا، ان کے ہاں اولاد ہوئی۔ حلیل نے کہا کہ قصی کے ہاں جو اولاد ہے وہ دراصل میری ہی اولاد ہے، لہٰذا اس نے مرتے وقت مکہ مکرمہ کی امارت اور بیت اللہ کے حقوق ولایت قصی کو وصیت کر دیے "اس طرح یہ تبدیلی واقع ہوئی۔ (٦)

نامور مؤرخ اور سیرت نگار ابن اسحاق نے اس کی حسب ذیل صورت بیان کی ہے:

جناب قصی کے ہاں چار بیٹے "عبدالدار، عبد مناف، عبد العزیٰ اور عبد پیدا ہوئے" جب قصی کے یہ بیٹے جوان ہو گئے اور ان کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہوگئی؛ اسی دوران میں حلیل کا انتقال ہو گیا اور جناب قصی نے یہ دیکھا کہ وہ کعبۂ معلیٰ کی تولیت اور مکہ معظّمہ کی حکومت کے بنوخزاعہ اور بنوبکر سے زیادہ مستحق ہیں اور یہ کہ (ان کا خاندان) قریش حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہے، تو انہوں نے قریش اور بنو کنانہ کے بہت سے لوگوں سے اس بارے میں مشورہ کیا اور انہیں بنوخزاعہ اور بنوبکر کے مکہ مکرمہ سے اخراج پر آمادہ کرلیا۔ ان سب لوگوں نے ان سے اتفاق کیا اور ان کی مدد کا وعدہ کرلیا۔

پھر انہوں اپنی والدہ کی طرف سے، اپنے قضاعی بھائی رزاح بن ربیعہ کو لکھا کہ وہ اس کی مدد کرے، چنانچہ رزاح بن ربیعہ اور ان کی والدہ کی طرف سے دوسرے بھائی بنو قضاعہ کے لوگوں کے ساتھ مکہ مکرمہ پہنچ گئے، اس کے بعد جناب قصی نے بنوخزاعہ کو مکہ چھوڑنے کا حکم دیا، تو انہوں نے سمجھا کہ "حلیل" نے انہیں

اس بات کی وصیت کی ہوگی، لہٰذا انہوں نے ان کی بات مان لی اور کہا، کہ ''آپ ہی کعبہ اور مکہ مکرمہ کے انتظام وانصرام کے ہم سے زیادہ مستحق ہیں اور وہاں سے چلے گئے۔ (۷) اور ان کی مخالفت نہیں کی۔ (۸)

لیکن ابن سعد نے السائب المخزومی کے حوالے سے جو طویل روایت نقل کی ہے، اس میں یہ اضافہ بھی ہے:

پھر رزاح اپنے اخیافی بھائیوں کے ہمراہ مکہ معظمہ آ گئے۔ اس وقت بنوصوفہ یعنی ''اولاد غوث بن مر'' لوگوں کو عرفہ سے لوٹا دیتے تھے اور یہ لوگ اس وقت تک کسی کو ''رمی جمار'' نہیں کرنے دیتے تھے، جب تک کہ ''بنوصوفہ'' کا کوئی شخص رمی جمار نہ کر لیتا.

جب آئندہ سال موسم حج آیا تو انہوں نے حسب سابق لوگوں کو رمی جمار سے منع کیا، اس پر قصی اور ان کے قریشی حلیف بنوکنانہ اور بنوقضاعہ کے ساتھی ان کے پاس عقبہ آئے اور کہا کہ ہم لوگ یہاں کی تولیت کا تم سے زیادہ حق رکھتے ہیں، مگر صوفہ (۹) نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا جس پر دونوں کے درمیان لڑائی ہوئی، جس کے نتیجے میں ''بنوصوفہ'' شکست کھا گئے، تو اس پر رزاح نے کہا، قصی لوگوں کو اجازت دو کہ وہ رمی جمار کریں چنانچہ انہوں نے سب لوگوں کو رمی جمار کی اجازت دے دی...... اس دن کے بعد آج تک عرفات سے واپسی (افاضہ) کا انتظام قصی کی اولاد میں چلا آتا ہے۔ بعد ازاں بنوخزعہ اور بنوبکر کو، اپنی حرکتوں پر ندامت ہوئی کہ انہوں نے لڑے بھڑے بغیر کعبہ کی تولیت قصی کے حوالے کر دی ہے، چنانچہ انہوں نے جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا، اس پر جناب قصی نے بھی جنگ کی تیاری کی اور الاطبع (نامی مقام) پر دونوں کے مابین شدید جنگ ہوئی، جس میں دونوں طرف سے بہت سے لوگ مارے گئے...... بالآخر دونوں نے یعمر بن عوف بن کعب کو حکم (پنچ) بنانے پر اتفاق کر لیا.

یعمر نے فیصلہ دیا کہ بیت اللہ شریف اور مکہ معظمہ کے انتظام وانصرام کا قصی بنوخزاعہ اور بنوبکر سے زیادہ استحقاق رکھتے ہیں اور اس جنگ میں بنوخزاعہ اور بنوبکر کے جو لوگ مارے گئے ہیں ان کا خون رائیگاں ہے، البتہ بنوخزاعہ اور بنوبکر نے

قریش کے جن لوگوں کو قتل کیا ہے وہ اس کا خون بہا ادا کریں گے، چنانچہ اس دن کے بعد، ان کا نام ''یعمر الشداخ'' پڑ گیا۔[۱۰]

اس طرح گویا جناب قصی نے اپنی عقل و دانش اور فہم و فراست سے صرف یہ کہ بنوخزاعہ سے بیت اللہ شریف کا قبضہ وگزار کرایا، بلکہ مستقل طور پر اس فتنے کا سد باب کرنے کے لیے مذکورہ بالا دونوں قبیلوں کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا۔

انہی کی کوششوں سے قریش کے لوگ اکٹھے ہوئے، جن کی بنا پر انہیں ''قریش'' کہا جاتا ہے۔

(2) جناب قصی کے کارنامے:

جناب قصی کے مذکورہ حالات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ انتہائی دور اندیش، صاحب فہم وفراست اور بڑے عقل اور بصیرت والے شخص تھے، چنانچہ انہوں نے جس طرح بنوخزاعہ اور بنوبکر سے مکہ مکرمہ اور بیت اللہ شریف کو واگزار کرایا اس سے ان کی عقل وفراست پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ انہوں نے مکہ مکرمہ پر اپنا قبضہ بحال کرنے کے بعد جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے، ان کا ذکر بھی دل چسپی سے خالی نہیں ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) حجاج کی خدمت:

جناب قصی سے پہلے حاجیوں کی خدمت کا کوئی منظم سلسلہ موجود نہ تھا، وہ دنیا کے پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس سلسلے کو باقاعدہ ایک منظم انداز میں ترتیب دیا اور پہلی مرتبہ حجاج کی خدمت کے لیے ''السقایہ'' الرفادہ، الندوہ اور اللواء[۱۱] کے مختلف شعبے قائم کیے۔ اس موقع پر انہوں نے اپنے قبیلے کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور کہا:

''اے گروہ قریش! تم اللہ کے (گھر کے) ہمسائے اور اس کے گھر والے اور اہل حرم ہو اور یہاں حج کے لیے آنے والے لوگ اللہ کے مہمان اور اس کے گھر کے زائر ہیں، لہٰذا وہ مہمانی کے طور پر اعزاز واکرام کے زیادہ مستحق ہیں، لہٰذا تم حج کے دنوں میں ان کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرو، تاآنکہ وہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں''

چنانچہ اس مقصد کے لیے وہ ہر سال اپنے مال میں سے ایک حصہ الگ کر لیتے تھے، جس سے وہ لوگوں کی مدد کرتے تھے اور منٰی اور مکہ مکرمہ میں حجاج کے قیام کے دنوں میں ان کے لیے کھانا تیار کرتے تھے اور چمڑے کے مشکیزوں میں پانی جمع کرتے اور لوگوں کو ان مشکیزوں میں سے پانی پلاتے۔ یہ سلسلہ زمانۂ اسلام تک جاری رہا، ان کے بعد یہ تمام شعبے ان کے صاحبزادے عبد مناف کو مل گئے۔ (۱۲)

بعض روایات میں ہے کہ جناب قصی نے جب حجاج کرام کی خدمت کا پروگرام ترتیب دیا، تو انہوں نے اپنی قوم سے خطاب کیا اور کہا:

''چنانچہ انہوں نے قریش مکہ پر حجاج کی خدمت کے لیے ٹیکس عائد کر دیا۔ اس طرح مکہ مکرمہ میں حجاج کی خدمت کی ابتداء ہوئی۔'' (۱۳۔الف)

2- قریشی قبائل کی یکجائی:

جناب قصی کے مہتم بالشان کارناموں میں سے ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے قریش کے مختلف قبائل کو، جو مکہ مکرمہ میں، ان کی مرکزیت اور سیاسی قوت نہ ہونے کے باعث، عرب کے مختلف علاقوں میں منتشر ہو گئے تھے، انہیں کعبہ معلّٰی کے آس پاس لا بسایا، جس کی بنا پر (ایک قول کی رو سے) اس خاندان کا نام قریش پڑ گیا...... جس کے معنی اکٹھے اور مجتمع ہونے کے ہیں۔ (۱۳) ...... ابو العباس عبد اللہ ان کے متعلق فرماتے ہیں:

وان قصیا من کریم غراسة لفی منهل لم یدن من کف قاضب

به جمع الله القبائل بعد ما تقسمها تهب الاکف السوالب (۱۴)

(یعنی اور بے شک قصی اپنی طبیعت کی مہربانی کی بنا پر ایسے چشمے ہیں، جو کسی ظالم کے ہاتھ کے قریب نہیں ہے، انہی کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قریشی قبیلوں کو جمع کیا، حالانکہ انہیں چھیننے والے ہاتھوں کی موت عامہ نے تقسیم کر دیا تھا)۔

3- مکہ مکرمہ کی توسیع

قصی نے پورے مکہ مکرمہ کو اپنی قوم کے مابین تقسیم کر دیا، جس کی بنا پر آبادی

والا حصہ لوگوں کے لیے تنگ پڑ گیا، ان دنوں مکہ مکرمہ میں خار دار جھاڑیوں اور درختوں کی کثرت تھی اور لوگ حرم میں اگنے والے درختوں کو کاٹنے سے ہچکچاتے تھے، مگر جناب قصی نے انہیں بتلایا کہ وہ تو انہیں اپنے مکانات بنانے کے لیے کاٹ رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ممانعت محض فساد پھیلانے کے لیے کاٹنے کی ہے، چنانچہ انہوں نے ان خود رو درختوں اور جھاڑیوں کو خود اپنے ہاتھوں سے کاٹنا شروع کیا جس سے دوسرے لوگوں کو بھی اس کی ترغیب ملی (۱۵) اس طرح مکہ مکرمہ کی توسیع ہوئی، اس میں مزید مکانات بنائے گئے اور اس کی آبادی اور رونق بڑھ گئی.

جناب قصی نے قریشی خاندانوں کو مکہ مکرمہ کے میدانی علاقے (ابطح) میں آباد کیا، جس کی بنا پر، وہ قریش "ابطح" کہلائے...... لیکن جو قریشی خاندان مکہ مکرمہ کے بیرونی (نکیر) حصے میں مقیم رہے (مثلاً بنو معیص بن عامر، بنو تمیم الادرم، بنو محارب اور بنو الحارث بن فہر) وہ قریش الظواہر کہلائے (۱۶)، جناب قصی کے اس اقدام سے مکہ مکرمہ آئندہ کے لیے سیاسی انتشار اور قبائلی جھگڑوں سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا.

4- دارالندوہ یا جمہوری حکومت کا قیام:

جناب قصی نے "مکہ مکرمہ" میں دارالندوہ (مشورے کا گھر یا پارلیمنٹ ہاؤس) کے نام سے ایک عمارت بنائی، جس کا دروازہ بیت اللہ شریف کی طرف کھلتا تھا۔ اس عمارت "میں قریش مکہ اپنے تمام مسائل باہمی مشورے سے حل کرتے تھے، یہاں تک کہ لوگوں کے نکاح، جنگ کے فیصلے اور مختلف موقعوں پر پیش آنے والے مسائل کے متعلق مشورے بھی اسی میں ہوتے تھے۔ یہ دارالندوہ یا پارلیمنٹ ہاؤس دنیا کی تاریخ میں قدیم ترین جمہوری حکومت کی مثال ہے، اس لیے کہ یہاں مکہ مکرمہ کے تمام علاقائی، مذہبی اور سیاسی مسائل کو باہمی مشورے اور بحث و مباحثے کے ذریعے طے کیا جاتا تھا اور پھر اس پر عمل ہوتا (۱۷)۔ نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف اقدامات سے متعلق فیصلے بھی اسی جگہ ہوتے تھے، شب ہجرت میں قریش

مکہ کا وہ اجلاس بھی اسی جگہ ہوا تھا، جس میں نبی اکرم ﷺ کے العیاذ باللہ قتل کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہاں سے ہجرت کا حکم عطا فرمایا۔

5- مزدلفہ میں آگ کا اہتمام:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں کو حج کے جو مناسک تعلیم دیئے تھے، ان میں وقوف عرفہ کے بعد، وقوف مزدلفہ کا حکم بھی شامل ہے، لیکن چونکہ میں لوگوں کی آمدرات کو ہوتی ہے اور اس زمانے میں روشنی کا کوئی اہتمام نہ تھا، اس لیے حج کے اس اہم رکن کی ادائیگی کے دوران میں لوگوں کو دشواری پیش آتی تھی، جناب قصی نے مزدلفہ میں آگ جلانے کا اہتمام کیا، جس سے یہ تکلیف دور ہوگئی اور یہاں آنے والے اور وقوف کرنے والے لوگوں کے لیے رہنمائی میسر آنے لگی۔ یہ آگ (دوسری صدی ہجری) تک برابر جلتی تھی (١٧)۔ اس کے بعد یقیناً صدیوں تک یہ اہتمام رہا، آج کل یہاں پیلے رنگ والی لائٹیں لگا دی گئی ہیں جو جناب قصی کی اس روایت ہی کا تسلسل معلوم ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ جناب قصی نے مکہ مکرمہ میں ایک کنواں کھدوایا۔ اور چمڑے کے بڑے بڑے مشکیزوں میں منیٰ اور عرفات میں لوگوں کو پانی مہیا کرنے کا انتظام کیا۔

جناب قصی کی اولاد:

جناب قصی کے ہاں چار صاحبزادے (عبد مناف، عبدالدار، عبدالعزیٰ اور عبد) اور دو صاحبزادیاں، تخمع اور مرہ پیدا ہوئیں۔ ان کی یہ تمام اولاد حبی بنت حلیل ہی کے بطن سے ہوئی، جو سردار خزاعہ حلیل بن حبشیہ کی صاحبزادی تھیں۔ (١٩)

جناب قصی کا انتقال ہوا۔ تو انہیں حجون میں دفن کیا گیا، ان کے انتقال پر ان کی صاحبزادی تخمع نے مرثیہ کہا...... (٢٠)

(٢) عبد مناف بن قصی

نبی اکرم ﷺ کے چوتھے جد امجد جناب عبد مناف، اصل نام مغیرہ تھا۔ وہ

بڑے حسین وجمیل شخص تھے۔ اور اپنے حسن و جمال کی بنا پر قمرالبطحا کہلاتے تھے۔

وہ اپنے والد محترم جناب قصی کے زمانے میں ہی منصب سرداری پر فائز ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضور ﷺ کے تمام بزرگوں کو فہم وفراست اور عقل مندی اور دانش وبصیرت سے جو حصہ وافر عطا کیا تھا۔ ان میں جناب عبد مناف بن قصی کا نام سرفہرست ہے۔

انہوں نے اپنے بھائی عبدالدار سے ''السقایہ'' اور ''الرفادہ'' کے حقوق جس طرح حاصل کیے اس سے ان کی فہم وبصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

عبدالرحمان السہیلی کے مطابق مناف کا لفظ اناف نیف سے ہے۔ جس کے معنی بلند ہونے کے ہیں۔ (۲۰۔الف)

جناب قصی زندگی بھر حجاج کرام کی خدمت کے سلسلے میں مذکورہ فرائض نہایت خوش اسلوبی اور ذمہ داری سے انجام دیتے رہے، پھر جب ان کا آخری وقت آیا تو انہوں نے یہ فرائض اپنے سب سے بڑے جناب عبدالدار کو سونپ دیئے، جو نبی اکرم ﷺ کے چوتھے جد امجد جناب عبد مناف کے بھائی تھے۔ جناب قصی نے آخری ایام میں یہ ذمہ داریاں عبدالدار کو سونپتے ہوئے یہ وصیت کی تھی کہ اگرچہ آپ کے بھائی آپ سے زیادہ طاقت ور اور صاحب دولت ہیں، مگر یہ ذمہ داریاں آپ نے ہی ادا کرنا ہیں۔ یہ وہی جد امجد ہیں جب قرآن مجید میں آیت مبارکہ:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ.(الشعراء) اور آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرایئے.

نازل ہوئی، تو آنحضور ﷺ نے انہی جد امجد تک کی اولاد کو اس کا مصداق سمجھتے ہوئے بلایا تھا اور اپنی دعوت کو انہی کی اولاد، یعنی بنو عبد مناف تک محدود رکھا تھا۔ (۲۲)

سیرت ابن ہشام میں ہے:

جب حضرت قصی بوڑھے ہو گئے، اور ان کے پہلوٹھی کے بیٹے عبدالدار ان

کے پاس تھے۔ اور عبد مناف کے ساری اولاد خوش حال اور کھاتے پیتے لوگ تھے۔ مگر عبدالدار کا حال قدرے پتلا تھا۔ تو انہوں نے جناب عبدالدار سے کہا:

''اے میرے بیٹے مجھے قسم ہے اللہ کی میں تجھے دوسرے لوگوں کے ساتھ ملا دوں گا، اگر چہ وہ مالی اعتبار سے تم پر فوقیت رکھتے ہیں۔'' ان میں سے کوئی شخص بیت اللہ میں داخل نہ ہو سکے گا جب تک آپ اس کا دروازہ نہیں کھولیں گے اور قریش جب کسی سے لڑیں گے تو جنگ کا جھنڈا تمہارے ہی ہاتھ میں ہوگا۔ اور کوئی شخص یہاں اب پانی پیے گا تو تمہارے پلانے سے پیے گا۔ اور قریش جب بھی کوئی امن کا معاہدہ کریں گے تو تمہارے ہی گھر میں کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے انہیں دارالندوہ دے دیا، اور الحجابہ، اللواء، السقایہ اور الرفادہ کی ذمہ داریاں بھی اسے دے دیں اور مذکورہ بالا قبیلے اپنے اپنے حلفاء کے ساتھ یہ ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔ (۲۲۔الف)

جناب قصی کے انتقال کے بعد کچھ عرصے تک تو معاملہ، اسی انداز میں چلتا رہا، لیکن بالآخر بیت اللہ کی خدمت کے لیے جناب قصی کے قائم کردہ شعبے عبد مناف اور عبدالدار کی اولاد میں باہمی نزاع کا سبب بن گئے۔ قصی کے باقی بیٹوں اور ان کی اولاد نے، مذکورہ شعبوں میں اپنا حصہ مانگا، مگر عبدالدار اور ان کی اولاد ان کی راہ میں مزاحم ہوئی اور یہ موقف اختیار کیا کہ یہ تمام عہدے انہیں ان کے والد جناب قصی نے سپرد کیے ہیں، لہٰذا ان پر کسی دوسرے کا کوئی استحقاق نہیں ہے، اس پر جناب قصی کا خاندان دو حصوں میں بٹ گیا، آدھے لوگ (بنو اسد بن عبدالعزی بن قصی، بنو زہرہ بن کلاب، بنو تیم بن مرہ اور بنو الحارث بن فہر) بنو عبد مناف کے ساتھ ہو گئے اور آدھے لوگ (بنو مخزوم، بنو سلیم، بنو جمح اور بنو عدی) بنو عبدالدار کے ساتھ مل گئے۔ اول الذکر فریق نے خوشبو والے پیالے میں اور مؤخر الذکر جماعت نے خون کے پیالے میں ہاتھ رکھ کر یہ معاہدہ کیا کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے، لیکن جنگ کی نوبت آنے سے قبل ہی دونوں فریقوں میں مصالحت ہو گئی، جس کی رو سے الرفادہ اور السقایہ کے شعبے رسول اللہ ﷺ کے خاندان (بنو عبد مناف)

کو مل گئے اور الحجابہ، اللواء اور الندوہ بدستور خاندان بنوعبدالدار کے پاس رہے۔ دور اسلام تک یہی صورت حال رہی۔ (۲۳)

جناب عبد مناف اور ان کی اولاد:

جناب عبد مناف کے ہاں بارہ اولادیں ہوئیں (چھ بیٹے اور چھ بیٹیاں)۔ جن میں آٹھ: (۱) المطلب بن عبد مناف، (۲) ہاشم بن عبد مناف، (۳) عبد شمس بن عبد مناف، (۴) تماضر بنت عبد مناف، (۵) الحنۃ (۶) القلابہ، (۷) برہ اور (۸) ہالہ ایک بیوی (عاتکہ بنت مرہ بن ھلال بن فالج بن ذکوان) سے، تین بیٹے یعنی نوفل (۹) ابوعمر، (۱۰) اور ابوعبیدہ درج ...... دوسری بیوی (واقدہ بنت ابی عدی، المازنیہ یعنی نبت عامر بن عبد نہم سے اور ایک بیٹی (۱۳) ریطہ بنت عبد مناف تیسری بیوی (الثقفیہ) سے پیدا ہوئی۔ (۲۴)

عبد مناف کے تمام بیٹے عقل مند اور صاحبان فہم وفراست تھے، البتہ ان میں جناب ہاشم کو خصوصی امتیاز حاصل تھا۔

(۳) ہاشم بن عبد مناف

اللہ تعالیٰ نے جناب عبد مناف کے بیٹوں میں جس شخصیت کو سب سے زیادہ سیادت و قیادت کا سلیقہ بخشا وہ ہاشم بن عبد مناف (بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لؤی) تھے، جن کا اصل نام ''عمرو'' تھا، مگر ایک خاص واقعے کی بنا پر ان کا لقب ہاشم پڑ گیا۔ (۲۵)

جناب ہاشم اس بات سے بہت اچھی طرح باخبر تھے کہ ''مکہ مکرمہ'' میں ''قریشیوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اور ان کا کوئی مستقل ذریعۂ معاش نہیں ہے۔ چنانچہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے قریش کے لیے گرمیوں اور سردیوں کے دو تجارتی سفری دوروں کا اہتمام کیا۔ وہ موسم سرما میں قریشی قافلے کو یمن اور حبشہ (Ethopia) میں لے جاتے تھے اور نجاشی سے ملاقات کرتے تھے، جو ان کی بہت زیادہ تعظیم کرتا تھا...... اور موسم گرما میں تجارتی سامان شام (فلسطین) کے

علاقے غزہ وغیرہ میں لے جاتے اور بعض اوقات انقرہ (ترکی) تک چلے جاتے، جہاں بعض اوقات "قیصر روم سے" بھی ان کی ملاقات ہو جاتی تھی۔ جو ان کا بہت زیادہ اکرام کرتا تھا۔ (۲۶) قرآن کریم کی سورہ ایلاف (۱۰۴/۲) میں اسی واقعے کی طرف سے اشارہ ہے۔

اس طرح انہوں نے اپنے لیے اور اپنے قبیلے کے لیے دو تجارتی کاروانوں یا سفروں کا آغاز کیا۔ جو قریش مکہ کے لیے معاشی اعتبار سے بے حد مفید ثابت ہوا۔

ان کی فیاضی کا ایک واقعہ:

ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں قحط پڑ گیا اور لوگ بھوک سے مرنے لگے۔ جناب ہاشم ان دنوں شام کے علاقے میں تھے، انہوں نے وہاں کافی تعداد میں روٹیاں بنوائیں اور انہیں اپنے ہمراہ لے کر مکہ معظمہ آ گئے۔ وہاں انہوں نے روٹیوں کو توڑا اور پھر جن اونٹوں پر انہیں لاد کر لائے تھے، انہیں ذبح کیا...... اور بڑی بڑی ہانڈیوں (دیگوں) میں روٹیوں اور گوشت کو پکا کر قریش مکہ کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا۔ قحط کے بعد لوگوں نے پہلی مرتبہ اتنا اچھا کھانا پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔ اس لیے ان کا نام ہاشم (از ہشم روٹیاں توڑنے اور لوگوں کو کھلانے والا) پڑ گیا۔ (۲۷)

اس کے علاوہ وہ حجاج کرام کی بے حد خدمت کرتے تھے اور انہیں اپنی جیب سے کھانا کھلاتے تھے۔ جس کی بنا پر ان کی شہرت دور دور تک جا پہنچی تھی۔ حضرت ہاشم بڑی خوبیوں اور اعلیٰ ترین انسانی اوصاف و کمالات والے بزرگ تھے۔

جناب ہاشم بن عبد مناف کی اس وصف کا متعدد شعرائے کرام نے بھی تذکرہ کیا ہے، مثال کے طور پر، عبداللہ بن الزبعریٰ، جو عہد نبوی کا نامور قریشی شاعر تھا، کہتا ہے:

عمرو الذی هشم الثرید لقومه   قوم مکه سنتین عجاف (۲۸)

(عمرو العلی، نے اپنی قوم کے لیے ثرید تیار کیا، اور اس وقت مکہ کے لوگ "بھوکے" اور کمزور تھے)۔

سنت الیه الرحلتان کلا هما سفر الشتا ورحلة الاصیاف

انہوں نے دو سفروں کا طریقہ چھوڑا ایک موسم کا سفر اور دوسرا موسم گرما کا۔

بنو عبد شمس سے رقابت کی ابتداء:

جناب ہاشم کی اس فیاضی اور ان کی یہ ہردلعزیزی ان کے بھتیجے امیہ بن عبد شمس کو پسند نہ آئی اور اسے اپنے چچا سے حسد پیدا ہو گیا۔ اس نے بھی جناب ہاشم کی طرح لوگوں کی دعوت کرنا چاہی، لیکن وہ ایسا نہ کر سکا جس سے اس کی جگ ہنسائی ہوئی۔ جس پر اس نے جناب ہاشم کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا، حالانکہ وہ اس کے چچا اور خاندان کے بزرگ تھے، اس کی ان باتوں کا جب ہاشم کو علم ہوا تو انہیں فطری طور پر رنج ہوا...... چنانچہ جناب ہاشم نے ''امیہ'' کو بلایا اور کہا کہ میں تم سے پچاس سیاہ آنکھوں والے اونٹوں پر، جنہیں ''وادی مکہ'' میں ذبح کیا جائے گا، دس سال کے لیے، مکہ مکرمہ سے جلا وطنی کا معاہدہ کرتا ہوں...... امیہ اس پر رضا مند ہو گیا...... اور بنو خزاعہ کے کاہن کو دونوں نے اپنا حکم مقرر کر لیا...... ہاشم نے حسب وعدہ اونٹ ذبح کیے اور وہاں جو لوگ موجود تھے انہیں اس کا گوشت کھلایا...... اور امیہ وہاں سے شام چلا گیا اور دس سال وہاں مقیم رہا۔ اس کے بعد اس کی واپسی ہوئی، اس طرح ان دنوں خاندانوں کے مابین منافرت اور دشمنی کی ابتدا ہوئی...... جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی...... عہد نبوی میں ''بنو امیہ'' کی عداوت و مخالفت میں بھی اس سابقہ رقابت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ (۲۹)

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جناب ہاشم بڑے عقل مند اور مدبر انسان تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے میں بنو عبدالدار سے الرفادہ اور السقایہ'' کے شعبے حاصل کیے، جن کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے...... اور جو ان کے بعد، ان کے خاندان میں منتقل ہوتے رہے۔

''السقایہ اور الرفادہ'' کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے جناب ہاشم ہر سال بڑی تعداد میں اپنا مال صرف کرتے تھے۔ اس کے علاوہ قریش مکہ میں سے ہر مالدار

شخص ایک سو مثقال ھرقلی (دینار) عطیہ دیتا تھا، اس رقم سے جناب ہاشم زمزم کی جگہ کے مقام پر (جو اس وقت تک دریافت نہ ہوا تھا) چمڑے کے بڑے بڑے حوض بناتے تھے...... اور ان میں مکہ مکرمہ کے مختلف علاقوں کے کنوؤں سے پانی لا لا کر جمع کرتے اور پھر ایام حج میں حاجیوں کو پانی پلاتے تھے۔ (۳۰)

اسی طرح وہ حاجیوں کے کھانے (الرفادہ) کا بھی بہت اعلیٰ انتظام کرتے تھے اور گوشت اور روٹی، گھی اور ستو وغیرہ سے کھانا تیار کر کے باہر سے آنے والے حجاج کی میزبانی کرتے تھے، یہ سلسلہ ۷ ذوالحجہ سے شروع ہوتا اور منیٰ سے حجاج کی واپسی (۱۲-۱۳ ذوالحجہ) تک جاری رہتا تھا۔ (۳۱)

ایک ایسے وقت میں جب مکہ مکرمہ میں حج اور زیارت کعبہ کے لیے آنے والے لوگوں کے لیے سہولتوں کا کوئی تصور نہ تھا، اتنی فیاضی اور دریا دلی کے ساتھ ان کی خدمت و مہمانی اور اس کے لیے اپنے سرمانے کا بے دریغ استعمال کرنا جناب ہاشم کے اعلیٰ ترین خصائص و کمالات میں سے ہے۔

۴۔ جناب عبدالمطلب کی پیدائش اور ہاشم کا انتقال:

جناب ہاشم کا زمانہ ''قریش مکہ'' کے سیاسی اور اقتصادی عروج اور ان کی مالی خوش حالی کا دور تھا۔ ان کے زمانے میں قریش مکہ کے تجارتی قافلے نہ صرف یہ کہ اندرون عرب نہایت امن و امان کے ساتھ سفر کرتے تھے، بلکہ بیرون عرب بھی انہیں نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ جس کا سہرا بڑی حد تک انہی کے سر ہے جنھوں نے قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں سے پروانۂ راہداری حاصل کر کے، تمام قریشی قافلوں کو یہ افتخار دیا تھا۔ (۳۲)

جناب ہاشم ایک مرتبہ ایک تجارتی قافلے کے ہمراہ مدینہ منورہ کے قریب سے گزرے۔ جب وہ اپنا سامان فروخت کرنے کے لیے یثرب کے بازار میں گئے، تو انہوں نے وہاں دیکھا کہ ایک اونچے چبوترے پر ایک عورت بیٹھی ہے جو اپنے نوکروں کے ذریعے بازار میں خرید و فروخت کر رہی ہے۔ جناب ہاشم نے جب اس

خاتون سے گفتگو کی اور لین دین کیا تو ان پر منکشف ہوا کہ یہ خاتون خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت عقل منداور صاحب فہم وفراست بھی ہے، جناب ہاشم نے اس خاتون کے متعلق پتہ کیا،تو معلوم ہوا کہ وہ قبیلۂ بنوالنجار کی "سلمٰی بنت عمرو" ہے، جو احیحہ بن الجلاح بن الحریش کے نکاح میں تھی اور ان سے ان کے دو بیٹے بھی پیدا ہوے۔ بعد میں احیحہ نے انہیں چھوڑ دیا۔ دوسری روایت کی رُو سے احیحہ سے حضرت سلمٰی نے اپنے نکاح میں یہ شرط رکھی تھی کہ وہ اپنے معاملے کی خودمختار ہو گی اور جب چاہے گی علیحدہ ہو سکے گی۔ چنانچہ انہوں نے اسی شرط کے تحت احیحہ سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ (ابن ہشام) بہرحال جناب ہاشم نے انہیں نکاح کا پیغام دیا۔سلمٰی نے اس پیغام کوخوشی سے قبول کیا۔ نکاح کے بعد، جناب ہاشم نے لوگوں کو پرتکلف کھانا کھلایا اور پھر اپنی بیوی کے ہمراہ اپنے گھر (مکہ مکرمہ) لوٹ آئے...... دستور کے مطابق بچے کی پیدائش سے پہلے انہوں نے اپنی بیوی کو اپنے میکے یثرب میں چھوڑا اور خود اپنے تجارتی سفر پر شام کے لیے روانہ ہو گئے (۳۳)۔ مقررہ مدت کے بعد ان کے گھر میں ایک بیٹے کی ولادت ہوئی، جن کا نام شیبہ رکھا تھا یہی شیبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جدامجد ہیں.

اس سلسلے میں ایک اہم نقطہ، جسے اکثر مؤرخین نے نظرانداز کیا ہے، وہ جناب ہاشم کی بنوخزرج سے سابقہ رشتہ داری ہے...... اس لیے کہ جناب ہاشم کی پہلی شادی ہند بنت عمرو بن ثعلبہ سے ہوئی...... جو بنوخزرج ہی سے تعلق رکھتی تھیں، اس لیے مدینہ منورہ میں ان کی آمد محض تجارتی مقاصد کے تحت نہ تھی، بلکہ وہ اپنی سابقہ رشتہ داری کی بنا پر یہاں آئے ہوں گے، جس سے جناب سلمی سے تعلق کی بنیاد پڑ گئی.

پیدائش کے وقت جناب شیبہ کے سر میں چند سفید بال تھے، جن کی بنا پر ان کا نام شیبہ (بوڑھا) پڑ گیا، اس کے بعد جناب ہاشم اپنے تجارتی سفر کے دوران میں غزہ پہنچ کر بیمار پڑے اور وہیں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انہیں وہیں سپرد خاک کر دیا گیا اس وقت ان کی عمر ۲۰ یا ۲۵ برس تھی (۳۴)، انہوں نے مرتے وقت جو ترکہ چھوڑا وہ ابورہم عبدالعزی نے...... ان کے صاحبزادے کے پاس مکہ مکرمہ پہنچا دیا.

جناب ہاشم نے کئی نکاح کیے، جن سے ان کے ہاں حسب ذیل درج ذیل اولادیں ہوئی:

(۱) جناب سلمی بنت عمرو النجاریہ سے: (۱) شیبۃ الحمد (عبدالمطلب) اور (۲) ایک بیٹی رقیہ بنت ہاشم کی ولادت ہوئی، مگر لڑکی بچپن میں انتقال کر گئی.

(۲) ہند بنت عمرو بن ثعلبہ...... الخزرجیہ سے: (۳) ابو صیفی (عمرو) بن ہاشم...... اور (۴) صفی پیدا ہوے...... ابو صیفی جناب ہاشم کی اولاد میں سب سے بڑے تھے۔ (۳۵)

(۳) قیلہ (الجزور) بنت عامر بن مالک الخزاعیہ...... (از بنو المصطلق) سے: (۵) اسد بن ہاشم کی ولادت ہوئی.

(۴) امیمہ بنت عدی بن عبداللہ بن دینار...... بن لوی سے: (۶) نضلہ بنت ہاشم، (۷) الشفا اور (۸) رقیہ پیدا ہوے.

(۵) عدی بنت حبیب بن الحارث سے: (۹) حنہ بنت ہاشم کی ولادت ہوئی. (۳۶)

(۶) ام عبداللہ (واقدہ) بنت ابی عدی (یا عدی، عامر) بن عبدنہم...... بن صعصعہ سے: (۱۰) ضعیفہ اور (۱۱) خالدہ پیدا ہوئیں.

جناب ہاشم کے نام پر ہی آپ کے خاندان کا نام ہاشمی پڑا۔

یوں تو علم وادب "آنحضور ﷺ کے اجداد میں ہمیشہ متوارث رہا...... لیکن یہ روایت آپ کے قریبی اجداد میں بہت مضبوط اور توانا نظر آتی ہے، چنانچہ ہاشم کی اولاد بڑی ادبی صلاحیتوں کی مالک تھی، چنانچہ ان کی دو صاحبزادیوں خالدہ بنت ہاشم اور الشفا بنت ہاشم کے اپنے والد کے متعلق کہے ہوئے جو مرثیے ابن سعد نے نقل کیے ہیں۔ (۳۷) ان سے ان کی عظیم ادبی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے.

(۴) عبدالمطلب (شیبۃ الحمد) بن ہاشم

جناب ہاشم بن عبد مناف کی اولاد میں عقل وفراست اور بزرگی میں ان کی جانشینی کا شرف المطلب بن ہاشم کو حاصل ہوا۔ اسی لیے ہاشم کے انتقال کے بعد خاندان کی سربراہی اور السقایہ اور الرفادہ کی ذمہ داریاں انہوں نے ہی سنبھالیں۔ ان دنوں جناب عبدالمطلب اپنی والدہ کے پاس یثرب (مدینہ منورہ) میں مقیم رہے۔

ایک دفعہ نامور صحابی اور شاعر دربار نبوی حضرت حسان بن ثابت انصاری کے والد ابو ''ثابت انصاری'' مکہ مکرمہ میں عمرہ کرنے کے لیے آئے۔ وہ جناب مطلب کے دوست تھے، انہوں نے ''مطلب سے کہا: اگر تم اپنے بھتیجے شیبہ کو، جو ہمارے پاس رہتا ہے، دیکھو، تو تم اس کی صورت میں جمال و ہیبت اور شرف مجسم کو دیکھو گے...... میں نے اسے اپنے ماموں کے ہمراہ تیراندازی کرتے دیکھا ہے وہ اپنے کمزور سے تیروں کو میری ہتھیلی جیسی تنگ جگہ میں داخل کر دیتا ہے اور جب وہ اپنا تیر اپنے نشان پر کامیابی سے مارتا ہے، تو کہتا ہے ''میں عمرو العلی'' کا بیٹا ہوں''۔(۳۸)

المطلب نے یہ سن کر کہا کہ میں آج شام ہونے سے پہلے اسے لانے کے لیے چل پڑوں گا۔ تاہم ثابت نے مشورہ دیا کہ سلمی اسے تمہارے حوالے نہ کرے گی، نہ ہی اس کے ماموں ہی اس کی اجازت دیں گے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ تم اسے وہیں رہنے دو، تا آنکہ وہ لوگ خود تمہیں عبدالمطلب کو دے دیں، لیکن جناب مطلب نے کہا، کہ میں اسے کسی حال میں بھی وہاں نہیں چھوڑ سکتا۔

چنانچہ مطلب مدینہ منورہ جا پہنچے اور پوچھتے پوچھتے اپنے بھتیجے کے گھر پہنچ گئے، جہاں نوجوان شیبۃ تیراندازی کر رہا تھا، انہوں نے اپنے بھتیجے کو دیکھا تو اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

بعض روایات میں ہے کہ جب جناب مطلب مدینہ منورہ پہنچے اس وقت ننھا شیبۃ بچوں کے ساتھ تیراندازی کر رہا تھا۔ جب اس کا تیر نشانے پر لگتا تو وہ اونچی

آواز سے نعرہ لگاتا:

انا ابن هاشم. انا ابن سيد البطحاء

(میں ہاشم اور سردار مکہ کا بیٹا ہوں)

ان کی والدہ سلمٰی کو پتہ چلا تو انہوں نے جناب مطلب کو اپنے ہاں آنے اور اپنے گھر میں قیام کرنے کی دعوت دی، مگر انہوں نے کہا میں اس وقت تک اپنا سامان نہیں کھولوں گا، جب تک میں اپنے بھتیجے کو نہ لے لوں اور اسے اپنے گھر نہ پہنچا دوں، انہوں نے کہا کہ وہ اسے ہرگز ان کے ساتھ نہ بھیجیں گی، مگر مطلب نے کہا، بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میرا بھتیجا اس غریب الوطنی میں غیر قوم میں بڑا ہو، حالانکہ ہم اپنی قوم میں بڑی عزت وشرف والے لوگ ہیں اور پھر اس کا اپنے وطن میں ٹھہرنا یہاں ٹھہرنے سے بدرجہا بہتر ہے اور پھر وہ جہاں بھی رہے گا، تمہارا ہی بیٹا ہوگا۔

نوجوان شیبہ کی والدہ نے جب یہ دیکھا کہ سردار قریش اپنے بھتیجے کو چھوڑنے والے نہیں، تو انہوں نے اس شرط پر اسے لے جانے کی اجازت دے دی کہ وہ ان کے ہاں تین دن قیام کریں گے اور انہیں خدمت وتواضع کا موقع دیں گے، چنانچہ جناب مطلب نے یہ دعوت قبول کر لی اور اس طرح تین دنوں کے بعد جناب مطلب اپنے بھتیجے کے ہمراہ مکہ مکرمہ واپس آ گئے۔

بعض روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ وہ انہیں ان کی والدہ کو بتائے بغیر اٹھا لائے، مگر ہمارے خیال میں یہ روایت درست نہیں ہے۔

لوگوں نے اس نوجوان کو جب ''سردار قریش'' مطلب کے ہمراہ دیکھا، تو انہوں نے کہا کہ یہ مطلب کا غلام (عبد) ہے، اگرچہ مطلب نے بار بار لوگوں کو بتایا کہ یہ ان کا غلام نہیں ہے، بلکہ ان کا بھتیجا ہے، لیکن یہ نام ''عبدالمطلب'' ایسا مشہور ہوا کہ وہ ان کے اصل نام شیبہ پر غالب آ گیا...... (۳۹)

عبدالمطلب کی پرورش مطلب کی سرپرستی اور ان کی گود میں ہوئی۔ اس طرح ان کی ذات میں جسمانی خصائص کے ساتھ ساتھ خاندانی اوصاف وکمالات بھی پیدا ہو گئے، چنانچہ جب وہ سن رشد کو پہنچے تو وہ اپنے ہم قوم لوگوں میں ممتاز اور

منفرد نظر آتے تھے۔

جناب مطلب یمن کے ایک تجارتی سفر کے دوران میں بردمان (یمن) میں ایسے بیمار پڑے کہ پھر جاں بر نہ ہو سکے اور انہیں وہیں سپرد خاک کر دیا گیا اور مکہ مکرمہ میں خاندانی قیادت و سیادت کی ذمہ داریاں جناب عبدالمطلب کے کندھوں پر آ پڑھیں۔اس طرح عبدالمطلب نوجوانی ہی میں ''سردار قریش'' تسلیم کر لیے گئے۔

عبدالمطلب نے اپنے اجداد کے شروع کیے گئے السقایہ اور الرفادہ کے کاموں کو آگے بڑھایا اور حجاج وزائرین کعبہ کی خدمت وتواضع میں نئی روایات قائم فرمائیں۔

عبدالمطلب کے عظیم کارنامے:

نبی اکرم ﷺ کے جد امجد جناب عبدالمطلب اپنے بہت سے کارناموں کے باعث ہمیشہ یادرکھے گئے ہیں، ان کے چند کارناموں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ا۔زم زم کی کھدائی اور دریافت:

اوپر یہ ذکر آ چکا ہے کہ ''چاہ زمزم'' کو اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہؑ کے لیے بطور نعمت جاری فرمایا تھا...... یہ کنواں کئی صدیوں تک لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی ''نعمت غیر مترقبہ'' کے طور پر موجود رہا، لیکن بنو جرھم نے مکہ مکرمہ سے نکلتے وقت کنوئیں کو مٹی سے اس طرح پاٹ دیا کہ اس کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا...... اور لوگوں کو یہ علم نہ رہا کہ یہ کنواں کس مقام پر تھا، جناب عبدالمطلب کے زمانے میں یہی صورت حال برقرار رہی۔

جناب عبدالمطلب جس مستعدی سے حجاج کرام اور زائرین کعبہ کی خدمت بجا لاتے تھے کچھ تو اس کا اثر تھا اور کچھ یہ بات بھی تھی کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے حقیقی وارث کے پیدا ہونے کا وقت قریب آ گیا تھا، لہٰذا آپ ﷺ کی ولادت سے قبل اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کے قریب جاری کیے گئے اس چشمہ صافی کو دوبارہ جاری کرنے کا فیصلہ فرمالیا، جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لیے جاری کیا گیا تھا اور جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے ایک بہت بڑے انعام کی

حیثیت رکھتا ہے اور اس کے لیے اسباب بھی خود ہی مہیا فرما دیئے.

روایات میں ہے کہ ایک دن جناب عبدالمطلب سو رہے تھے کہ خواب میں انہیں کہا گیا، کہ تم ''طیبہ'' نامی مقام کھودو، انہوں نے پوچھا طیبہ کیا ہے؟......مگر جواب نہ دیا گیا.

دوسرا دن ہوا، تو انہیں کہا گیا، برہ (۴۰) نامی جگہ کھودو، پوچھا برہ کیا ہے، مگر کوئی جواب نہ ملا.

تیسرا دن ہوا، تو خواب میں کہا گیا، ''المضنونہ (۳۹) نام کی جگہ کھودو...... پوچھا المضنونہ کیا ہے؟ مگر جواب نہ ملا.

چوتھا دن ہوا، تو انہیں کہا گیا: زمزم کھودو...... انہوں نے پوچھا۔ زمزم کیا ہے؟ کہا گیا: وہ (ایسا چشمہ ہے جو) نہ تو خشک ہوگا اور نہ ہی اس کی مرمت کی جائے گی۔ اسے بہت بڑی تعداد میں حجاج پئیں گے، اور وہ ''غراب العصم'' کے پاس گوبرا اور خون کے درمیان چیونٹیوں کی بستی کے پاس واقع ہے (۴۱) اور یہ چشمہ تمہارے اور تمہاری آل واولاد کے لیے مشروب ہے...... (۴۲)

چنانچہ اگلے روز سیدنا عبدالمطلب اپنے بیٹے الحارث کے ہمراہ اس کنوئیں کی کھدائی کے لیے چل پڑے۔ اس وقت تک صرف یہی ان کے بیٹے پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت کیسا منظر ہوگا، جب یہ دونوں باپ بیٹے کنواں کھود رہے تھے اور قریش مکہ کے باقی لوگ ان سے بے اعتنائی برت رہے تھے۔ اگر ''جذبہ صادق'' اور عزم مصمم ہو تو بڑی بڑی چٹانیں بھی سر ہو جاتی ہیں، چنانچہ انہوں نے نہایت جواں مردی اور عزم و ہمت سے کنوئیں کی کھدائی کا سلسلہ جاری رکھا، تین دنوں کے بعد کنوئیں کی منڈیر دکھائی دی، جسے دیکھ کر عبدالمطلب نے زور سے نعرہ تکبیر بلند کیا، اس پر قریش مکہ بھی جمع ہو گئے، سب نے پہچان لیا کہ یہ منڈیر تو سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے زمانے کی ہے، لہٰذا انہوں نے مطالبہ کیا کہ انہیں بھی اس شرف و سعادت والے کام میں شامل کر لیا جائے، لیکن جناب عبدالمطلب نے کہا، کہ یہ ایک ایسا شرف ہے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان میرا انتخاب کیا ہے، لہٰذا میں تمہیں اس میں شامل

اور شریک نہیں کر سکتا۔ (۴۳)

پانی برآمد ہونے پر سارے قبیلۂ قریش نے زمزم سے پانی پیا اور کہا کہ اے عبدالمطلب یہ کنواں آپ کی ملکیت رہے گا اور ہم کبھی اس کے متعلق آپ سے جھگڑا نہیں کریں گے۔

جناب عبدالمطلب نے جب مزید کھدائی کی، تو انہیں بنو جرھم کے کنوئیں میں دفن کردہ دو سنہرے ہرن، سات سنہری تلواریں اور پانچ مکمل زرھیں ملیں، عبدالمطلب بڑے عبادت گزار شخص تھے، انہوں نے دونوں ہرنوں والا سونا کعبہ معلّٰی کے دروازے پر لگوا دیا، تلواروں کو بیت اللہ کے دروازے پر لٹکا دیا اور اس سے بیت اللہ شریف کی چابی اور اسکا قفل بنوایا۔ (۴۴)

۲۔ بیٹے کی قربانی کی نذر:

دنیا میں ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ جو شخص خالص رضائے الٰہی کے لیے کام کرتا ہو، دنیا کے لوگ اس سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ آنحضور ﷺ کے جدامجد کو بھی اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا...... ایک روایت کی رو سے، جب وہ ''چاہ زمزم'' کی کھدائی کر رہے تھے، تو اس وقت انہیں اپنے حامیوں اور مددگاروں کی کمی کا احساس ہوا (۴۵) لیکن انہیں یہ احساس صرف اسی موقع پر پیدا نہ ہوا ہوگا، بلکہ وہ جب بھی حجاج کرام اور زائرین بیت اللہ کی خدمت کے لیے کمر بستہ ہوتے ہوں گے انہیں اپنے ساتھیوں کی قلت کا خیال برابر ستاتا ہوگا، چنانچہ ایک ایسے ہی موقع پر انہوں نے یہ نذر مان لی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں دس بیٹے عطا کیے تو وہ ایک بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیں گے۔

چنانچہ جب ان کی یہ نذر پوری ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں دس بیٹوں سے نواز دیا تو انہوں نے اپنی ساری اولاد کو جمع کیا اور ان کے سامنے اپنی نذر کا مسئلہ پیش کیا اور ان سے مشورہ مانگا، ان کا جواب وہی تھا، جو ان کے جدامجد سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے دیا تھا، سب نے کہا:

اوف بنذرک وافعل ماشئت — اپنی نذر پوری کرو جو آپ چاہتے ہیں، وہی کرو.

سیدنا عبدالمطلب نے کہا کہ تم میں سے ہر ایک اپنا اپنا نام ایک ایک تیر پر لکھ دے اور پھر انہوں نے ''بیت اللہ'' کے حاجب (دربان) سے کہا کہ اپنا پیالہ گھماؤ، چنانچہ اس نے جب پیالہ گھمایا تو آنحضور ﷺ کے والد محترم جناب ''عبداللہ'' کا نام نکل آیا۔ جناب عبدالمطلب اپنے اس فرزند کو سب سے زیادہ چاہتے تھے اور وہ اپنے تمام بھائیوں اپنی بہنوں اور خاندانوں کے لوگوں میں بھی بہت ہر دلعزیز تھے......

چنانچہ جب عبدالمطلب نے ایک ہاتھ میں عبداللہ کا ہاتھ پکڑا اور دوسرے ہاتھ میں چھری لی اور ''اساف و نائلہ'' کے بتوں کی طرف، جہاں جانور ذبح کیے جاتے تھے، چل دیئے۔ تو اس پر قریش مکہ کے وہ تمام رؤساء جو اپنی اپنی مجلسوں میں بیٹھے تھے، باہر نکل آئے اور انہوں نے پوچھا کہ سردار قریش اپنے صاحبزادے کو کہاں لے جا رہے ہو؟ انہوں نے کہ میں اسے اللہ کی راہ میں قربان کرنے جا رہا ہوں۔ قریشی سرداروں، جناب عبداللہ کے بھائیوں اور ان کی بہنوں نے بضد ہو کر کہا کہ بخدا تم ایسا ہرگز نہ کرو گے اور اگر تم نے ایسے کیا، تو پھر ہر شخص اپنے بیٹے کو لا کر اسی طرح ذبح کرے گا اور دنیا کی بستیاں انسانوں سے خالی ہو جائیں گی. (۴۶)

ایک روایت کے مطابق عبدالمطلب نے اپنے فرزند کو ذبح کرنے کے لیے نیچے لٹا لیا تھا اور ان پر اپنا پاؤں بھی رکھ دیا تھا، اس وقت حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب نے انہیں چھڑایا، جس سے ان کے چہرے پر زخم لگ گیا، جو ان کی وفات تک ان کے چہرے پر موجود رہا.

قریش مکہ نے عبدالمطلب کو مشورہ دیا کہ وہ حجاز (مدینہ منورہ یا خیبر) میں موجود کاہنہ سے مشورہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے ایسے ہی کیا۔ کاہنہ نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ ایک طرف اپنے بیٹے عبداللہ کو رکھیں اور دوسری طرف دس اونٹ رکھیں اور پھر تیروں کے ذریعے قرعہ نکالیں۔ اگر اونٹوں پر قرعہ نکل آئے تو فبھا ورنہ دس اونٹوں کا اضافہ کر دیں اور قرعہ نکالیں اور مثبت جواب نہ ملنے کی صورت میں دس

دس اونٹوں کا اضافہ کرتے رہیں جب تک مطلوبہ جواب نہ مل جائے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے ''جدامجد'' نے اسی نسخے پر عمل کیا اور اونٹوں کی تعداد بڑھاتے رہے، یہاں کہ اونٹوں کی تعداد سو ہو گئی، اب جب فال لی گئی تو وہ اونٹوں کے نام پر نکلی۔ اس پر انہوں نے تین مرتبہ فال نکال کر اطمینان کر لیا۔ اس طرح انہوں نے اپنی نذر پوری کرنے کے لیے سو اونٹ ذبح کیے اور ان کا گوشت لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ (۴۷)

اسی بنا پر سیرت نگاروں نے صراحت کی ہے کہ جناب عبدالمطلب پہلے شخص ہیں۔ جنہوں نے انسانی جان کا بدلہ سو (۱۰۰) اونٹ مقرر کیے۔ جس کے بعد قریش مکہ میں بھی یہی دستورالعمل جاری ہو گیا۔ اور اسلام نے بھی اسی نصاب کو برقرار رکھا۔ (۴۷۔الف)

اس طرح رسول ﷺ کو اللہ کی راہ میں دو ''ذبیحوں'' کی اولاد پیدا ہونے کا اعزاز حاصل ہوا، جو آپ ﷺ کے اس ارشاد مبارک سے ظاہر ہے ''کہ میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں''

نبی اکرم ﷺ کو اگر کوئی ''یا ابن الذبیحین'' کہہ کر پکارتا تو آپ اس سے مسرور ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک بدّو آپ کی خدمت میں آیا۔ اور اس نے آنحضور ﷺ کو ''یا ابن الذبیحین'' کہہ کر پکارا تو آپ یہ سن کر مسکرا دیئے۔

۳۔حجاج کرام کی خدمت وتواضع

جناب عبدالمطلب کے عظیم الشان کارناموں میں یہ کارنامہ بھی شامل ہے کہ انہوں نے ''حجاج کرام'' کی خدمت اور زائرین مکہ کی مہمان نوازی کے لیے عظیم روایات قائم کیں۔ مؤرخین کے مطابق وہ اپنے بزرگوں کی طرح بہت دل جمعی سے حاجیوں اور زائرین کی خدمت وتواضع کرتے تھے۔ اسی بنا پر انہیں لوگ ''فیاض'' اور ''مطعم'' (کھانا کھلانے والا) کہتے تھے (۴۸) ...... بقول ابن اسحاق رحمہ اللہ وہ زمزم کی دریافت سے قبل مکہ مکرمہ کے کنوؤں سے اور زمزم کی

دریافت کے بعد، چاہ زمزم سے منیٰ اور عرفات میں چمڑے کے بڑے بڑے مشکیزوں میں پانی جمع کر کے حجاج کرام کو پلاتے تھے۔ (۴۹)

۴۔ معاہدات حلف:

جناب عبدالمطلب بڑے مدبر اور معاملہ فہم انسان تھے، انہیں معلوم تھا کہ مکہ مکرمہ اور ''بیت اللہ شریف'' کی تولیت پر قبضہ برقرار رکھنا ایک کٹھن کام ہے، اس لیے کہ اس سے قبل بھی صدیوں تک بنو جرہم اور پھر بنوخزاعہ زبردستی یہاں قابض رہ چکے تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے مکہ مکرمہ کے آس پاس بسنے والے قبائل، مثلاً بنو خزاعہ، بنو کنانہ اور بنو ثقیف سے حِلف (دوستی و اتحاد) کے معاہدے کیے......
بقول ابن سعد، انہوں نے جس مجلس میں بنوخزاعہ سے حلف کا معاہدہ کیا اس میں انہوں نے قریش مکہ کو بھی طلب کیا، لیکن وہ نہ آئے تو سردار قریش نے ان سے حلف کا معاہدہ کر لیا اور اپنی اولاد کو بھی وصیت کی کہ وہ اس اتحاد اور حلف کی پاسداری کریں۔ (۵۰) چنانچہ ان کی اولاد بھی ان معاہدوں پر عمل پیرا رہی۔

بعض روایات میں ہے، کہ جب قریش مکہ نے اپنے حلیفوں بنوبکر کے ساتھ مل کر بنو خزاعہ کا عین صحن حرم میں قتل عام کیا۔ تو بنوخزاعہ نے مدینہ منورہ میں آ کر نبی اکرم ﷺ کو اس معاہدے واسطہ دے کر مدد کی درخواست کی تھی۔

۵۔ اصحاب الفیل کے حملے کے وقت، جناب عبدالمطلب کا کردار

نبی اکرم ﷺ کی ولادت سال (۵۶۹ء یا ۵۷۰ء) عام الفیل، یعنی ہاتھی کا سال کہلاتا ہے، اس سال یمن کے ایک حکمران ابرھۃ الاشرم نے بیت اللہ شریف پر حملہ کر کے، اسے تباہ کرنے کی کوشش کی تھی، مگر اس کے نتیجے میں وہ خود مارا گیا۔

ابن سعد نے لکھا ہے کہ نجاشی شاہ حبشہ نے ''ارياط ابوصحم'' کو چار ہزار کا لشکر دے کر یمن پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ چنانچہ اس نے اس پورے خطے پر قبضہ کر لیا اور شرفاء کو ذلیل و خوار کر کے حکومت قائم کر لی۔ اس کے لشکر کے لوگوں میں سے

''ابرھۃ الاشرم'' نے ارياط کو قتل کر کے ......یمن پر قبضہ کر لیا.

ابرھہ نے حج کے دنوں میں جب لوگوں کو بیت اللہ شریف اور حج کے لیے آتے دیکھا، تو اس نے پوچھا کہ یہ لوگ کہاں جاتے ہیں۔ لوگوں نے اسے بتایا کہ وہ بیت اللہ شریف کا حج کرنے جاتے ہیں۔ اس نے پوچھا وہ کس شے کا بنا ہوا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ پتھر کا، پوچھا، اس پر غلاف کس شے کا ہے، لوگوں نے کہا۔ کہ وہ یہاں سے ہی الوسائل نامی ریشمی کپڑے کا تیار ہو کر جاتا ہے، اس نے کہا مجھے قسم ہے یسوع مسیح کی میں تمہارے لیے اس سے بھی بہتر ''گھر'' بناؤں گا.

چنانچہ اس نے سفید، سرخ، پیلے اور سیاہ رنگ کے سنگ مرمر سے گرجا گھر بنوایا۔ اسے سونے اور چاندی سے سجایا اور اس کے اندر جواہرات لٹکائے ...... اس کے دروازوں پر سونے کی پتریاں چڑھائیں اور سنہری کیل لگوائے اور درمیان میں موتی لگوائے اور اس میں سرخ رنگ کا ایک بہت بڑا یاقوت (موتی) لگایا.

پھر اس نے لوگوں کو اس کے حج کا حکم دیا۔ چنانچہ چند عرب قبائل نے اس کا حج کیا، مگر یہ سب کچھ اس کے ڈر اور خوف کی بنا پر تھا، چنانچہ ایک شخص نفیل الخثعمی نے ایک دن رات کے وقت اس کے گرجا گھر میں گندگی کر دی اور مردار لا کر پھینک دیا۔ اس پر ابرھہ کو بڑا غصہ آیا اور اس نے کہا کہ میں عربوں کے ''کعبہ'' کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ چنانچہ اس نے نجاشی کو پورے واقعے کی خبر دی اور کہا کہ اس کے لیے اس کا خاص ہاتھی ''محمود'' بھیج دیا جائے۔ وہ اتنا بڑا ہاتھی تھا کہ دنیا میں کوئی اور ہاتھی اپنی جسامت اور عظمت میں اس جیسا نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے یہ ہاتھی اس کے پاس بھیج دیا۔ چنانچہ ابرھہ بہت بڑے لشکر کے ساتھ حملہ کرنے کے لیے چل پڑا اور مکہ کے پاس آ کر اپنا خیمہ لگایا اور اپنے فوجیوں کو حکم دیا کہ لوگوں کے اونٹ اور دوسرے جانور پکڑ لائیں، چنانچہ عبدالمطلب کے اونٹ بھی پکڑے گئے۔ وہ نوفل الخثعمی کے توسط سے ابرھہ کے پاس گئے۔ ابرھہ نے یہ سمجھ کر کہ سردار قریش آئے ہیں ان کا بڑا احترام کیا اور آنے کا سبب پوچھا۔ انہوں نے کہا میں اپنے اونٹ جو آپ کی فوج نے پکڑ لیے ہیں چھڑانے آیا ہوں۔ اس نے کہا کہ شاید تمہیں علم نہیں کہ

میں تمہارا یہ "بیت اللہ" گرانے آیا ہوں اور تم اپنے اونٹوں کی بات کرتے ہو۔ سردار قریش نے کہا کہ میں ان اونٹوں کا مالک ہوں، لہٰذا مجھے ان کی فکر ہے۔ اس گھر کا بھی ایک مالک ہے۔ وہ اپنے گھر کی خود حفاظت کر لے گا، چنانچہ عبدالمطلب اپنے اونٹ لے کر چلے گئے...... پھر انہوں نے بیت اللہ کے پاس جا کر رو رو کر دعا کی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑوں (حراء) پر چلے گئے۔ اس موقع پر انہوں نے درج ذیل اشعار میں اللہ تعالیٰ سے مدد کی دعا کی:

لاھم ان المرء یمنع رحله فامنع حلالک

لا یغلبن صلیبھم ومحالھم غدواً محالک

ان کنت تارکھم وقبلتنا فامر مابدالک

(کوئی غم نہیں ہر انسان اپنے کجاوے کی حفاظت کرتا ہے۔ اے اللہ تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔ ان کی صلیب اور اسلحہ تیرے مکان پر غالب نہ ہو، اگر تو انہیں اور ہمارے قبیلے کو چھوڑ دے تو جو تو چاہے کر۔)

اسی وقت اللہ تعالیٰ نے سمندر کی طرف سے چھوٹے چھوٹے پرندوں کو بھیجا۔ جن کے منہ میں تین تین کنکریاں تھیں، انہوں نے یہ کنکریاں ان پر برسانا شروع کر دیں جس شخص پر کنکری گرتی وہ اس کے جسم پر گولی کی طرح لگتی اور اسے موقع پر ہلاک کر دیتی، دیکھتے ہی دیکھتے تمام لشکر تباہ ہو گیا اور خود ابرھہ بھی واپسی کے فوراً بعد مر گیا۔ (۴۸-الف)

۶۔ کالا خضاب لگانے کی ابتداء:

مروی ہے کہ جناب عبدالمطلب کے بال جلد ہی سفید ہو گئے تھے اور وہ یمن میں حمیری بادشاہوں میں سے کسی کے ہاں جا کر ٹھہرتے تھے۔ ایک مرتبہ اس نے جناب عبدالمطلب سے کہا کہ آپ اپنے بالوں پر خضاب کیوں نہیں لگاتے۔ چنانچہ انہوں نے بادشاہ کے کہنے پر پہلے مہندی کا اور پھر کالے رنگ کا خضاب لگایا۔ اور اس کی کچھ مقدار اپنے ہمراہ بھی لے لی۔ جب وہ اپنے گھر میں آئے۔ تو ان کی بیوی

نتیلہ (والدہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ) نے کہا: اگر یہ خضاب ہمیشہ رہے تو کتنا اچھا ہو۔ اس پر عبدالطلب نے اشعار کہے جن انہوں نے میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کیا۔ اس طرح مکہ مکرمہ میں خضاب کا رواج پڑا۔ (۴۸۔ب)

۷۔ بارش کے لیے دعاء

جناب عبدالمطلب پہلے شخص ہیں۔ جنہوں نے بارش کے لیے مخصوص طریقے پر دعا کرنے کی ابتدا۔ کی مروی ہے کہ ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں قحط پڑا اور بارش کا سلسلہ رک گیا۔ ایک خاتون رقیقہ بنت ابی صیفی بن مقام کو خواب آیا کہ اگر فلاں صفات والا شخص اپنے خاندان اور سب لوگوں کے ہمراہ باہر نکل کر دعا کرلے تو باران رحمت ضرور برسے گی۔ یہ تمام صفات جناب عبدالمطلب میں پائی جاتی تھیں چنانچہ انہوں نے خاندان کے لوگوں کے ہمراہ جن میں ننھے محمد بھی تھے۔ جبل ابوقبیس پر چڑھ کر دعا کی۔ تو فوراً باران رحمت کا نزول ہوگیا۔ (۴۸۔ج)

۸۔ جبل نور (حراء) کے عبادت کی ابتداء

اسی طرح جناب عبدالمطلب پہلے شخص ہیں، جنہوں نے جبل نور (غار حراء) میں جا کر عبادت کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ جب رمضان المبارک کا مہینہ آتا تو وہ عموماً کوہ حراء پر چلے جاتے۔ اور پورا مہینہ یا کم وبیش دن وہاں گزارتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی غالباً اس مقام پر عبادت کرنے کا طریقہ انہی سے لیا تھا۔

عبدالمطلب کی اولاد:

جناب عبدالمطلب نے چھ شادیاں کیں، جس سے ان کے ہاں بارہ بیٹے اور چھ بیٹیاں پیدا ہوئیں، تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) نتیلہ بنت جناب بن کلیب بن مالک بن عمرو بن عامر بن زید مناۃ...... (۵۱) سے: (۱) حضرت عباس۔

(۲) جناب ضرار (جوان دنوں میں، جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کی ابتداء

ہوئی۔ لا ولد فوت ہو گئے)، اور

(۳) اور جناب قثم کی ولادت ہوئی۔

(۲) ھالہ بنت وھیب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب...... سے: (۴) حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، (۵) المقوم رضی اللہ عنہ، [۵۲] (۶) حجل، [۵۳] (جن کا کثرت فیاضی کے باعث لقب الفیداق تھا)۔ اور (۷) صفیہ والدہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ [۵۴] کی ولادت ہوئی۔

(۳) جناب فاطمہ بنت عمرو بن عائذ عمران بن مخزوم سے: (۸) جناب عبداللہ، (۹) ابو طالب [۵۵]، (۱۰) زبیر [۵۶]، (۱۱) حضرت عاتکہ، (۱۲) ام حکیم، (۱۳) برہ، (۱۴) عبد الکعبہ (جناب عبدالمطلب کی زندگی میں فوت ہو گئے)، (۱۵) امیمہ، (۱۶) اروی اور (۱۷) ام البیضاء کی ولادت ہوئی۔ یہ خاتون جناب عبدالمطلب کی سب سے زیادہ اولاد کی ماں ہیں، ان کی والدہ کا نام صخرہ بنت عبد عمران بن مخزوم تھا۔

(۴) سراء (یا صفیہ) بنت جنیدب بن حجیر بن ذباب بن حبیب...... (از بنو بکر بن ھوازن)، جناب (۱۹) الحارث بن سعد بن عبدالمطلب کی والدہ ہیں، (حضرت الحارث عبدالمطلب کی سب سے بڑی اولاد تھے۔ جو ان کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے تھے)۔

(۵) لبنی بنت ہاجر بن عبد مناف بن ضاطر...... بن حبشیہ بن سلول بن کعب: (۲۰) ابولہب (عبدالعزیٰ، ابوعبد) کی ماں تھیں۔

(۶) ممنعہ بنت عمرو بن مالک...... الخزاعیہ: (۲۱) الفیداق نامی بیٹے کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ [۵۷]

جناب عبدالمطلب بڑی شان اور بڑے دبدبے والے بزرگ تھے۔ ان کے زمانے میں قریش مکہ میں کوئی شخص بھی ان کے برابر کا نہ تھا۔ ان کی کرسی کعبہ معلی کے پاس بچھائی جاتی تھی۔ اور قریش مکہ ان کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھتے تھے۔ اور جناب عبدالمطلب اپنے ننھے پوتے (آنحضور ﷺ) سے بے حد محبت کرتے

تھے۔ اور انہیں اپنے برابر مسند پر بٹھاتے تھے۔ قریش مکہ جب پوچھتے تو آپ فرماتے ''میرے اس بیٹے کو اللہ تعالیٰ بڑی بزرگی عطا کرے گا۔'' اور آپ ﷺ کی عمر ابھی آٹھ برس کی تھی کہ آپ ﷺ کے دادا کا وصال ہو گیا۔ اس وقت ننھے محمد ﷺ بھی روتے ہوئے جناب عبدالمطلب کے جنازہ کے پیچھے چل رہے تھے۔ انہیں بھی الحجون کے مقام پر دفن کیا گیا۔

جناب عبدالمطلب کی وفات:

جناب المطلب نے ایک طویل عمر (۸۲ یا ۸۸ یا ۱۱۰) پا کر نواح ۵۷۹ء میں مکہ مکرمہ میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے۔ (۵۸)

اس موقع پر ان کی صاحبزادیوں نے بڑے رقت انگیز مرثیے کہے۔

۵۔ جناب عبداللہ بن عبدالمطلب

آنحضور ﷺ کے والد محترم جناب عبداللہ اپنے تمام بہن بھائیوں میں غیر معمولی صفات اور عمدہ ترین اخلاق کے حامل تھے. ان کی کنیت ابو قثم، ابو محمد اور ابو احمد ہے، جبکہ لقب الذبیح ہے۔

ان کی والدہ محترمہ حضرت فاطمہ بنت عمرو بن عائذ بن عمران المخزومیہ تھیں...... اس طرح ان کی ذات میں عرب کی دو بڑے خاندانوں یعنی بنو ہاشم اور بنو مخزوم کا خون دوڑ رہا تھا، روایت کے مطابق ام الحکیم البیضاء (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نانی) جناب عبداللہ کی توأم (جڑواں) بہن تھیں.

جناب عبداللہ کی ولادت (اندازاً) ۲۴ جلوس نوشیروانی / ۵۵۴ء یعنی ولادت نبوی سے قریباً ۱۷ برس (یا بعض روایات کی رو سے ۲۵ برس) قبل مکہ مکرمہ میں ہوئی...... اوپر گزر چکا ہے کہ ان کی ولادت سے جناب عبدالمطلب کی وہ نذر پوری ہو گئی، جو انہوں نے چاہ زمزم کی کھدائی کے وقت مانی تھی اور یہ عہد کیا تھا کہ اگر ان کے ہاں دس بیٹے ہو گئے اور وہ سب جوان ہو گئے، تو وہ ان میں سے ایک بیٹے کو اللہ

کی راہ میں قربان کر دیں گے۔ یہ قرعہ حضرت عبداللہ کے نام پر نکلا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے جد امجد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح انہیں بھی اس آزمائش میں سرخرو کیا اور ان کے بدلے سو اونٹوں کی قربانی قبول کر لی...... (۵۹) تفصیل جناب عبدالمطلب کے حالات میں گزر چکی ہے۔

جناب عبداللہ نہایت نیک طینت اور راست باز انسان تھے۔ اسی لیے جوان ہوتے ہی، مکہ مکرمہ کے کئی معزز گھرانوں سے ان کے لیے نکاح کے پیغام آنا شروع ہو گئے، مگر اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت سرزمین مکہ کی سب سے محترم، سب سے زیادہ نیک، سب سے زیادہ پاک باز خاتون سیدہ آمنہ کی قسمت میں لکھی تھی، اسی لیے جناب عبدالمطلب نے وہب بن عبد مناف بن زہرہ کی دختر نیک اختر حضرت ''آمنہ'' کا رشتہ قبول فرما لیا اور اپنے بیٹے عبداللہ کو ان سے بیاہ دیا...... یہ مبارک تقریب ۴۰ نوشیروانی / ۵۶۹ء۔ میں انجام پائی، اس وقت جناب عبداللہ کی عمر مبارک سترہ برس سے کچھ زیادہ یا ۱۸ برس تھی۔ (۶۰)

ابن سعد نے اس تقریب کا حال، المسور بن المخرمہ اور محمد بن علی بن الحسین کے حوالے سے یوں بیان کیا ہے:

''حضرت آمنہ (بنت وھب بن عبد مناف بن زھرہ بن کلاب بن مرہ...... جن کی والدہ برّہ بنت عبدالعزی بن عثمان بن عبدالدار بن قصی بن کلاب تھیں) اپنے والد کی وفات کے بعد اپنے چچا جناب وھیب بن عبد مناف بن زھرہ کی سرپرستی میں تھیں، جناب عبدالمطلب اپنے بیٹے حضرت عبداللہ کے ہمراہ...... وھیب بن عبد مناف کے گھر تشریف لے گئے اور ان سے ان کی بھتیجی کا رشتہ جناب عبداللہ کے لیے طلب کیا اور وہیب کی اپنی بیٹی ھالہ بنت وھیب کا رشتہ اپنے لیے مانگا...... چنانچہ وھیب نے دونوں رشتے قبول کیے اور اپنی بھتیجی کو جناب عبداللہ سے اور اپنی بیٹی کو جناب عبدالمطلب سے بیاہ دیا، اس طرح یہ دونوں بابرکت نکاح ایک ہی مجلس میں ہوئے...... ھالہ سے...... حمزہ اور بھتیجی آمنہ بنت وھب سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی'' (۶۱)

عربوں کے ہاں یہ بھی رواج تھا کہ وہ شادی کے بعد تین دن اپنے سسرال

میں قیام کرتے تھے۔ جناب عبداللہ نے بھی شادی کے بعد تین دن سیدہ حضرت آمنہ کے والدین کے ہاں قیام کیا، اور پھر اپنے گھر تشریف لائے۔

جناب عبداللہ کی بیماری اور وفات:

چونکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت کا تقاضا یہی تھا کہ اس کے آخری رسول ﷺ کی ولادت اور پرورش یتیمی کی حالت میں ہو، تاکہ لوگ آپ کی اعلیٰ ترین اخلاقی وفکری صفات کو آپ کی بہتر تربیت و پرورش کی طرف منسوب نہ کرسکیں، اس لیے جناب عبداللہ شادی کے کچھ دنوں کے بعد (ولادت نبوی سے ٦ ماہ قبل) عین نوجوانی کے عالم میں، انتقال فرما گئے۔ اس کا ظاہری سبب یہ بنا کہ حضرت عبداللہ قریش مکہ کے ایک تجارتی قافلے کے ہمراہ اپنا سامان تجارت لے کر شام کے علاقے غزہ گئے ہوئے تھے۔ جہاں قریش مکہ کے تجارتی قافلے عموماً جایا کرتے، مگر وہاں جا کر بیمار پڑ گئے۔ واپسی میں چونکہ کمزوری زیادہ تھی، اس لیے مدینہ منورہ میں اپنے والد محترم کے ننھیال (بنونجار) میں ٹھہر گئے اور ایک مہینے تک علیل رہے۔ بنونجار نے کئی دنوں تک ان کی تیمارداری کی، مگر ان کی علالت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور ادھر قافلے والوں نے مکہ مکرمہ پہنچ کر جناب عبدالمطلب کو اس صورت حال سے آگاہ کیا، تو انہوں نے اپنے صاحبزادے الحارث (یا بقول البلاذری الزبیر) کو مدینہ منورہ بھیجا، لیکن جب الحارث وہاں پہنچے تو اس سے پہلے ہی جناب عبداللہ عالم غربت میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے اور انہیں وہیں (دارالنابغہ میں) دفن کر دیا گیا۔ (٦٢) ۔ یہ واقعہ یکم رمضان المبارک ٥٧٠/٤٠ جلوس نوشیروانی کو عام الفیل سے ۴ ماہ ١٧ دن پہلے (اور ولادت نبوی سے چھ ماہ قبل) پیش آیا۔ دوسری روایت کی رُو سے جناب عبدالمطلب نے انہیں یثرب کی کھجور لینے بھیجا تھا اور اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ حضرت زبیر ان کی وفات سے پہلے پہنچ گئے تھے اور انہوں نے ہی ان کی تدفین کی تھی۔

جناب عبداللہ کی وفات کے وقت نبی اکرم ﷺ کی عمر مبارک کتنی تھی، اس

حوالے سے زیادہ مشہور قول تو یہ ہے کہ آپ ﷺ ابھی شکم مادر میں تھے، کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ یہی قول اکثر علماء کے نزدیک زیادہ محقق ہے۔

دوسرے قول کی رُو سے آپ اس وقت سات ماہ کے تھے۔ جبکہ تیسرا قول بیس ماہ کی عمر کا بھی مروی ہے (۶۲۔الف)

بعض علما کے بقول ان کی قبر بھی ''الابواء'' میں ہے، اس وقت جناب عبداللہ کی عمر مبارک ۲۵ برس تھی، لیکن امام الطبری نے ان کی قبر مدینہ منورہ میں ہونے کی صراحت کی ہے۔ جب نوجوان عبداللہ کے انتقال کی خبر مکہ مکرمہ میں ان کے والد محترم اوران کے بھائیوں کو پہنچی، تو انہیں سخت رنج اور صدمہ ہوا...... (۶۳)، لیکن ان میں سب سے زیادہ غم تو اس خاتون محترم کا تھا، جنہوں نے مکے کے اس سجیلے نوجوان کو ابھی آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھا تھا، کہ خزاں کا موسم آ گیا......سیدہ آمنہ کے غم واندوہ اور اپنے عظیم خاوند سے محبت کے جذبات ان اشعار سے بھی ظاہر ہوتے ہیں جو ابن سعد نے محمد بن عمرو بن واقد اسلمی کی روایت سے نقل کیے ہیں۔ سیدہ اپنے خاوند کے متعلق فرماتی ہیں:

عفا جانب البطحاء من ابن هاشم	وجاور لحداً خار جاً في الغماغم
دعته المنايا دعوةً فاجابها	وما تركت في الناس مثل ابن هاشم
عشيةً راحوا سريره	تعاوره اصحابه في التزاحم
فان يك غالته المنايا وريبها	فقد كان معطاءً كثير التراحم

یعنی ابن ہاشم (عبداللہ) بطحاء کی جانب چلا گیا، اور وہ الغمائم (شوروغل والی جگہ) سے باہر قبر میں جا بیٹھا اور موت نے اسے جیسے ہی بلایا اس نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ اور لوگوں میں ابن ہاشم جیسا کوئی آدمی نہیں بچا۔ جس شام لوگ اس کے جسد خاکی کو اٹھائے لے جا رہے تھے پھر اس کے ساتھی باری باری اسے کندھا دیتے تھے، اگر اسے موتوں اور شک نے ہلاک کر دیا ہے تو (کوئی بات نہیں) اس لیے کہ وہ بہت سخی اور لوگوں پر بہت زیادہ رحم کرنے والے انسان تھے۔

جنابِ عبداللہ کے وصال کے بعد جناب عبدالمطلب نے اپنے پوتے ننھے محمد کا

جس طرح خیال رکھا۔ وہ جناب عبداللہ اور ان کے خاندان سے ان کی محبت کا مظہر ہے۔اور پھر جناب آمنہ کے وصال کے بعد انہوں نے ننھے محمد کو اپنی گود میں لے لیا تھا اور ہر وقت انہیں اپنے قریب رکھتے تھے۔اور اپنی وفات کے وقت جناب ابو طالب کو وصیت کی کہ وہ ان کے بعد آنحضور ﷺ کا خصوصی خیال رکھیں۔

جناب عبداللہ کی وراثت:

نبی اکرم ﷺ کو اپنے والد حضرت عبداللہ کی طرف سے درج ذیل اشیاء بطور وراثت ملیں:

ایک خادمہ (ام ایمن)،اوراک،کھانے والے پانچ اونٹ اور کچھ بھیڑ بکریاں۔

(ابن سعد: ۱/۱۰۰)

۶۔سیدہ آمنہ بنت وھب

نبی اکرم ﷺ کے والد محترم کی طرح آپ ﷺ کی والدہ قدسیہ بھی انتہائی نیک، برگزیدہ اور اعلیٰ ترین انسانی اوصاف وکمالات کی حامل خاتون تھیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت چھوٹی سی عمر میں اتنا فہم اور اتنی ذکاوت وفراست عطا کر دی تھی کہ اس کا عشر عشیر بھی اس دور کی دوسری عورتوں میں نظر نہیں آتا۔حضرت آمنہ ظاہرہ حسن و جمال کے ساتھ جمال باطنی کی دولت سے بھی مالا مال تھیں،انہوں نے اپنے لخت جگر کی جس طرح پرورش کی اور انہیں اپنے والد محترم کی قبر دکھانے کے لیے جس ہمت وشجاعت کے ساتھ سفر کیا، اس سے ان کی عظمت و بزرگی کا روشن پہلو آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔

جناب حضرت آمنہ کے متعلق تمام سیرت نگار اس بات پر متفق ہیں کہ جناب عبداللہ اور حضرت آمنہ کی نبی اکرم ﷺ کے سوا کوئی اور اولاد نہیں تھی۔اور نہ ہی ان دونوں بزرگوں کا اس سے پہلے یا اس کے بعد کوئی اور نکاح ہوا۔

حضرت آمنہ کو جن خواتین نے دیکھا اور سنا...... وہ سب ان کی عظمت و بزرگی اور نیکی و پارسائی کی معترف ہیں۔انہوں نے حضرت آمنہ سے، دوران حمل کی جو

کیفیات نقل کی ہیں، ان سے بھی ان کی عظمت و شرافت پر روشنی پڑتی ہے، چنانچہ وھب بن زمعہ اپنی پھپھی سے روایت کرتے ہیں کہ جناب آمنہ فرمایا کرتی تھی:

''مجھے جب حمل ہوا، تو مجھے اس کا نہ تو کبھی احساس ہوا اور نہ ہی کبھی اس کا میں نے کوئی بوجھ محسوس کیا، جیسے کہ عام طور پر عورتیں محسوس کرتی ہیں۔ ایک مرتبہ ایک آنے والا (فرشتہ) آیا اور اس وقت میں نیند اور بیداری کی درمیانی کیفیت میں تھی اور اس نے کہا: کیا تجھے علم ہے کہ تو حاملہ ہے، میں نے کہا، مجھے تو احساس نہیں ہے، کہا گیا تم اس امت کے سردار اور اس کے نبی کو اٹھائے ہوئے ہو''(۶۵)

ایک اور روایت میں ہے کہ جناب آمنہ کو خواب ہی میں حکم ملا کہ وہ نومولود کا نام ''احمد'' رکھیں (۶۶) اور ابو امامہ الباھلی صحابی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں، کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

رأت امی کانه خرج منها نور اضاءت منه قصور الشام...... (۶۷)	میری والدہ نے یہ دیکھا کہ جیسے ان کے جسم سے ایسا نور نکلا ہے، جس سے شام کے محلات روشن کر دیئے۔

جناب آمنہ کے قلب و ذہن کی صفائی اور ان کے ''دل و دماغ کی بلندی کا مزید اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ جب ننھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک چھ برس کی ہوئی، تو وہ اپنے ''لخت جگر'' کے ہمراہ مدینہ منورہ اپنے خاوند کی قبر کی زیارت کے لیے روانہ ہوئیں۔

انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انا حضرت ام یمن رضی اللہ عنہا کو بھی اپنے ساتھ لیا، دونوں خواتین دو اونٹوں پر سوار تھیں۔ (۶۸)

یہ قافلہ اسی مکان (دار النابعہ) میں جا کر اترا۔ جہاں جناب عبداللہ نے اپنا آخری وقت گزارا تھا، یہ چونکہ جناب عبداللہ کے والد کی ننھیال بھی تھی، اس لیے انہیں یہاں بڑے احترم و اکرام سے ٹھہرایا گیا۔ آپ یہاں ایک ماہ مقیم رہیں۔

اس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چھ برس کے تھے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی سفر کی بہت سی باتیں یاد رہ گئی تھیں، مثال کے طور پر، جب ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو

عدی بن النجار کی ایک گڑھی (اطم) کو دیکھا، تو فرمایا میں انصار کی ایک لڑکی ''انیسہ'' کے ساتھ یہاں کھیلتا تھا، پھر جب آپ ﷺ نے دارالنابغۃ کو دیکھا، فرمایا: اسی جگہ میری والدہ مجھے لے کر آئی تھیں اور اسی گھر میں میرے والد کی قبر تھی اور میں نے عدی بن نجار کے کنوئیں میں تیرنا سیکھا تھا۔ ام ایمن کے مطابق کچھ یہودی یہاں آتے اور آپ کو دیکھتے تو کہتے، کہ یہ اس امت کا نبی ہے اور یہ (یثرب بعد کا مدینہ) اس کا دارالہجرت ہے (۶۹)، چنانچہ اس کے بعد...... وہ ننھے محمد ﷺ کو لے کر...... واپس آ گئیں.

واپسی کے سفر میں جب، قافلہ الابواء کے مقام پر پہنچا، تو آپ یہاں آ کر بیمار ہو گئیں اور ایک دو یوم کی مختصری علالت کے بعد عالم بقاء کو رحلت فرما گئیں (۷۰)۔

ابواء وادی ودان کا ایک گاؤں ہے، ودان اور ابواء میں قریباً ۶ یا ۸ میل کا فاصلہ ہے۔ یہاں عہد نبوی میں ایک جنگ بھی لڑی گئی، جسے ''الابواء یا غزوۂ ودان'' کہا جاتا ہے.

بقول علامہ طاہر کردی، ابواء، ودان اور مستورہ ایک ہی علاقہ میں واقع ہیں، جو قبائل ضمرہ، غفار اور کنانہ کا مسکن ہے۔ مستورہ کے مشرق میں ۲۸ کیلومیٹر کے فاصلے پر ابواء واقع ہے، آج کل وہ بے آباد ہے.

قدیم زمانے میں رابغ سے مدینہ منورہ جانے کے لیے دو راستے تھے، ایک راستہ یودی سے مستورہ اور دوسرا یودی سے ''ہرشی'' جاتا، پھر ہرشی سے دو راستے، ایک راستہ ''مبیر یک'' اور القاحا کی طرف سے اور دوسرا ابواء اور المصفرہ کی جانب سے جاتا تھا۔ المصفرہ ابواء کی مغربی جانب اس پہاڑ کے قریب واقع ہے، جس پر سیدہ آمنہ کی قبر مبارک ہے۔ ابواء میں داخل ہوتے ہی، دائیں ہاتھ پر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر سیدہ آمنہ محو خواب ہیں جن کی سادہ سی قبر، دور سے ہی نظر آتی ہے، کیونکہ اس کے چاروں طرف ایک میٹر کے قریب پتھر رکھتے ہوئے ہیں، اس کے قرب و جوار میں کوئی دوسری قبر نہیں ہے۔ بقول علامہ کردی، وہاں کے باشندوں نے بتایا کہ پہاڑی پر قبر غالباً اس لیے بنائی گئی، تاکہ جنگلی درندوں اور سیلاب سے محفوظ رہے، دوسرے اس لیے کہ اس جگہ کو کھودنا سہل ہے۔ (۷۱)

نبی اکرم ﷺ غزوہ حدیبیہ سے واپسی پر اس مقام سے گزرے تھے۔

اور انہوں نے اپنی والدہ کے مزار پر حاضری دی تھی، اس موقع پر آپ ﷺ پر اتنی رقت طاری ہوئی، اور آپ اتنا روئے تھے کہ زندگی بھر میں کبھی آپ ﷺ کو اتنی شدت کے ساتھ روتے نہیں دیکھا گیا۔ نبوت کے یہ آنسو دراصل اس چشمہ محبت کا فیضان تھا، جو اس مقام پر محو خواب ہے...... اللہ تعالیٰ آں مستورہ کے درجے بلند فرمائے. افسوس کے آنحضور ﷺ کے پاکیزہ آنسوؤں کا یہ مدفن اور سیدہ آمنہ کی خوشبوؤں اور رحمتوں سے بجی قبر کا نشان بھی ......سعودی حکومت نے مٹا دیا ہے۔

حوالہ جات وحواشی

(۱) یہ محض قیاس ہے.

(۲) بقول یاقوت المعجم، یہ مقام تبوک کے نزدیک حجاز کی شمالی سرحد پر، یا عین شمالی سرحد کے اندر یرموک کے نزدیک واقع ہے (دیکھیے البکری، ص۲۷۷).

(۳) ابن سعد، ۴۶/۱.

(۴) ابن ہشام، ۴۴۶/۱.

(۵) ابن سعد، ۴۷/۱.

(۶) ایضاً، ۴۷/۱-۴۸.

(۷) ابن کثیر، ۲۰۵/۱ (حاشیہ۲).

(۸) ابن سعد، ۶۸/۱.

(۹) یہ غالباً بنوخزاعہ کا کوئی بطن (شاخ) یا خاندان تھا.

(۱۰) ابن ہشام، ۴۴۶/۱-۴۴۷.

(۱۱) الحجابہ..... سے مراد بیت اللہ شریف کھولنے اور بند کرنے کی خدمت ہے.

السقایہ...... سے مراد ایام حج میں حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت بجالانا ہے.

الرفادہ...... سے مراد حج کے دنوں میں حاجیوں کو کھانا کھلانا ہے.

الندوہ .. مشورہ اس سے جنگ یا صلح وغیرہ کے سلسلے میں مشاورت مراد ہے.

اللواء.. جھنڈا...... اس سے، جنگ میں علمبرداری کا منصب مراد ہے.

یہ تمام کے تمام بڑے اہم عہدے تھے: جن کی ابتداء جناب قصی نے کی تھی.

(۱۲) ابن سعد، ۱/۵۲-۵۳.

(۱۳) ابن سعد، ۱/۴۹.

(۱۳۔الف) البلاذری، انساب الاشراف: ۱/۵۲

(۱۴) ابن کثیر، ۲/۱۹۷.

(۱۵) ابن سعد، ۱/۶۹.

(۱۶) ایضاً

(۱۷) ابن سعد، ۱/۵۰۔ یہ تاریخی گھر دور اسلام میں بنو عبدالدار کے بعد حضرت حکیم رضی اللہ عنہ بن حزام کے پاس آیا، انہوں نے اسے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک لاکھ درہم کے عوض فروخت کر دیا۔ اس پر انہیں امیر معاویہ نے ملامت کی، کہ تو نے اپنی قوم کی عزت کو ایک لاکھ درہم میں فروخت کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام نے عزت و احترام کے یہ تمام معیار ختم کر دیئے ہیں اور پھر کہا کہ تم گواہ رہو کہ میں نے یہ ایک لاکھ درہم راہ خداوندی میں صدقہ کر دیئے۔ اور کہا کہ اسے انہوں نے شراب کے ایک مٹکے کے عوض خریدا تھا (ابن سعد).

(۱۸) ابن سعد، ۱/۵۲.

(۱۹) ابن ہشام، السیرۃ، ۱/۴۱۶.

(۲۰) ابن سعد، ۱/۷۳.

(۲۰۔الف) السہیلی، الروض الانف، ۱/۲۴۔۲۵

(۲۱) القرآن، الشعراء (۲۱۴).

(۲۲) ابن سعد، ۱/۵۲.

(۲۲۔الف) ابن ہشام، ۱/۱۳۰۔۱۳۱

(۲۳) المطلب عبد مناف کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے، انہوں نے حبشہ کی سرزمین پر قریش مکہ کے لیے تجارت کی نجاشی (شاہ حبشہ) سے خصوصی اجازت لی تھی (ابن سعد ۱/۷۵)۔ جبکہ نوفل بن عبد مناف نے کسرائے ایران سے، قریش مکہ کی تجارت کے لیے اجازت حاصل کی.

(۲۴) ابن سعد، ۱/۷۵.

(۲۵) ابن سعد، ۱/۷۵-۷۶۔ انہوں نے ہرقل (شاہ روم) سے رومی علاقے میں قریش مکہ کے لیے

تجارتی سرگرمیوں کی اجازت حاصل کی تھی، نیز دیکھیے البدایہ، ۲۰۹/۱.

(۲۶) دیکھیے، القرآن الکریم، سورہ قریش (۱۰۳) اور اس کی تفسیریں.

(۲۷) ابن سعد، ۵۵/۱.

(۲۸) دیکھیے، البلاذری: انساب الاشراف، ۱: ۵۸؛ النویری، نہایۃ الارب فی فنون العرب ۲: ۳۵۸.

(۲۹) ابن سعد، ۵۵/۱.

(۳۰) ابن سعد، ۷۷/۱.

(۳۱) ایضاً، ۷۸/۱.

(۳۲) ایضاً

(۳۳) ابن سعد (۷۷/۱) کی روایت ہے۔ دوسری روایت (دیکھیے البلاذری) کی رو سے جناب ہاشم قبیلہ خزرج کے خاندان بنو النجار میں اپنے ایک دوست ''عمرو بن زید'' کے ہاں ٹھہرے، جو ''سلمی بن عمرو'' کے والد تھے،...... چنانچہ انہوں نے اپنے دوست عمرو کو ان کی بیٹی سلمٰی کے لیے پیغام دیا جو انہوں نے قبول کر لیا (دیکھیے الطبری ۹۳۷/۱-۹۳۵، ۹۸۰ تا ۹۸۱، البلاذری، انساب ۶۴/۱ تا ۸۵.)

(۳۴) ایضاً، ۷۷/۱- ۷۸. البلاذری، انساب الاشراف: ۵۹/۱، البلاذری نے ۲۵ سال کی عمر کو زیادہ قرین قیاس قرار دیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ قریش مکہ کے ہاں کم عمر کی شادیوں کا رواج تھا۔ جناب ہاشم نے ۲۵ برس کی عمر تک۔ چھ خواتین سے نکاح کیے۔ اور ان کے ہاں پانچ بیٹیاں اور پانچ بیٹے پیدا ہوئے۔

(۳۵) ایضاً، ۷۹/۱.

(۳۶) ابن سعد، ۵۹/۱-۶۰.

(۳۷) طبقات، ۶۰/۱-۶۱.

(۳۸) البلاذری، انساب الاشراف، ۶۰/۱، جناب عبدالمطلب کی کہانی میں کئی باتیں غور طلب ہیں: اولاً یہ اپنے خاندان کی وفات کے بعد ان کی والدہ یثرب (مدینہ منورہ) چلی گئی تھیں اور یہ کہ ان کی ولادت وہیں ہوئی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ خاتون (سلمی بنت عمرو) سے جناب ہاشم کی دو اولادوں کا ہونا ثابت ہے جن میں ایک تو جناب عبدالمطلب (شیبۃ الحمد) ہیں اور دوسری

اولاد رقیہ بنت ھاشم ہیں، رقیہ کے متعلق یہ صراحت ہے کہ وہ بچپن میں انتقال کر گئی تھیں۔ اس لیے یہ ممکن ہے کہ جناب عبدالمطلب کا ان کے قبیلے کو علم نہ ہو، ثانیاً یہ کہ جناب عبدالمطلب اپنے ننھیال میں ہی جوان ہوئے، کیا اتنی عمر تک ان کے خاندان والے لوگ ان سے غافل رہے؟......

ہمارے خیال میں صورت حال کچھ اس طرح رہی ہوگی، کہ جناب ہاشم کے انتقال کے بعد، ان کی والدہ سلمیٰ اپنے والدین کے ہاں چلی گئی ہوں گی، اور خاندان کے لوگوں نے خود ہی اجازت دی ہوگی، کہ ننھا عبدالمطلب اپنی والدہ کے پاس رہے اور جب انہیں پتہ چلا کہ بچہ جوان ہوگیا ہے، تو مطلب انہیں اپنے ہمراہ لے آئے۔

(۳۹) ابن سعد، ۱/۶۲-۶۳.

(۴۰) طیبہ اور برہ سے مراد چاہ زمزم ہے، اسے یہ نام اس کے کثرت منافع کی بنا پر دیئے گئے ہیں۔ (ابن سعد، ۱/۶۳).

(۴۱) یہ بھی زمزم کا نام ہے، یہ نام اسے اس کی نفاست اور عمدگی کی بنا پر دیا گیا.

(۴۲) اس مقام پر جب جانور ذبح کیے جاتے تو صورت حال وہی ہوتی تھی، جس کا ذکر اس روایت میں ہے.

(۴۳) ابن سعد، ۱/۶۴.

(۴۴) ابن سعد، الطبقات (۱/۶۴-۶۵) میں اس موقع پر ایک طویل واقعہ بھی نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ جناب عبدالمطلب نے جب اس بارے میں اصرار دیکھا تو کہا، کہ اگر تم میری بات مانتے ہو تو جس سے تم چاہو، فیصلہ کرا لو، چنانچہ شام کے ایک شہر میں رہنے والی ایک کاھنہ کے پاس جانے کا فیصلہ ہوا، لیکن راستے میں ایک نشان دیکھ کر سب لوگوں کو جناب عبدالمطلب کی سچائی پر یقین آ گیا.

(۴۵) ابن سعد، ۱/۶۵.

(۴۶) ایضاً

(۴۷) ابن کثیر، البدایہ، ۱/۲۴۸.

(۴۷) محمد بن یوسف الشامی، سبل الہدیٰ والرشاد: ۱/۲۴۶

(۴۸) البدایہ،۲/۲۴۹۔

(۴۸۔الف) ابن سعد:۸۶۔۸۷

(۴۸۔ج) ایضاً

(۴۹) اردو دائرہ معارف اسلامیہ،۱۲/۹۵۷۔

(۵۰) ابن سعد،۱/۵۸۔

(۵۱) بقول امام السہیلی جناب نتیلہ ملوک ربیعہ (یعنی یمن کے قدیم حکمرانوں) کے خاندان سے تھی، نتیلہ کی والدہ ام حجر یا ام کرز بنت الازب تھیں، جن کا تعلق ہمدان کے بنو بکیل سے تھا(السہیلی،۱/۴۳۶)۔

(۵۲) ان کے ہاں صرف ایک بیٹی پیدا ہوئی (السہیلی،۱/۴۷۳)۔

(۵۳) امام السہیلی فرماتے ہیں کہ حجول کے معنی بڑے مشکیزے، بڑی گوہ اور الحرباء وغیرہ کے ہیں، الحجل کا نام مصعب یا المغیرہ تھا۔ وہ لا ولد فوت ہوئے (السہیلی،۱/۴۳۶)۔

(۵۴) حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھپھی اور نامور صحابیہ تھیں۔ وہ جناب عوام کے نکاح میں آئیں اور حضرت زبیر بن العوام کی والدہ تھیں (الاصابہ)، وہ بہت سے احادیث کی راویہ ہیں۔

(۵۵) ابو طالب بن عبدالمطلب (م ۳ ق ھ / ۶۲۰ء)، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ عم محترم ہیں، جنہوں نے آپ کی اپنے بچوں کی طرح پرورش کی، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عقیل رضی اللہ عنہ اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے والد محترم تھے...... ان کا نام عبد مناف تھا۔

(۵۶) جناب زبیر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے چچا تھے۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بچپن میں اپنی گود میں اٹھا کر کھلاتے تھے۔ اور آپ کو لوری سناتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے۔

محمد بن عبدم　　عشت بعيش انعم

في دولة و مغنم　　دام سجيس الازلم

ان کی ایک بیٹی ضباعہ تھی، جو حضرت المقداد کے نکاح میں تھیں اور ان کا ایک بیٹا عبداللہ اور الطاہر تھا، جن کی بنا پر انہوں نے اپنی کنیت ابو طاہر رکھی تھی۔ اور انہی کے نام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صاحبزادے کا نام ''طاہر'' رکھا تھا۔ ان کا یہ بیٹا قریش

کے بڑے سمجھدار اور عقل مند لوگوں میں سے تھا (السہیلی ،۱/۴۳۷_۴۳۸)۔
جناب زبیر کے متعلق منقول ہے کہ انہیں مکہ مکرمہ کے ایک ظالم شخص کے متعلق بتایا گیا کہ وہ مر گیا ہے پوچھا کس سزا کے تحت مرا ہے۔ بتایا گیا کہ وہ خودکشی سے مرا ہے، جناب زبیر نے کہا، ''پھر لازماً کوئی ایسا دن ہوگا، جس میں اللہ تعالیٰ مظلوموں کا ظالموں سے بدلہ لے گا۔ (ایضاً)، اس طرح وہ گویا قیامت کے دن کے قائل تھے...... (نیز دیکھیے ابن ہشام،۱/۱۰۸، حاشیہ).

(۵۷) ابن سعد،۱/۹۱-۹۲.

(۵۸) دیکھیے ابن ہشام،۱/۴۴۰.

(۵۸_الف) البلاذری، انساب الاشراف:۱/۹۱

(۵۹) ابن سعد،۱/۸۸-۸۹.

(۶۰) ابن سعد،۱/۹۵.

(۶۱) ابن سعد،۱/۸۱، ابن سعد کے بقول وہ جگہ ہے کہ جب کوئی شخص اس کے اندر جاتا ہے، تو الدریہ نامی مقام اس کے دائیں طرف ہوتا ہے. یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ بہت سے غیر محتاط مؤرخین نے نور نبوت کو ظاہر کرنے کے شوق میں یہاں عجیب وغریب بے سروپا قصے تراشے ہیں۔ مثلاً بہت سی ایسی عورتوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے جناب عبداللہ کو شادی سے پہلے ان کے ساتھ بدکاری کرنے کی دعوت دی اور اس کے لیے ایک سو اونٹ تک دینے کا وعدہ کیا۔ اور پھر یہ بھی لکھا ہے کہ جناب عبداللہ نے شادی کے بعد اس عورت کی دعوت قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ تو اس عورت یا ان عورتوں نے کہا کہ **قد کان ذالک مرة فالیوم لا** (وہ اس وقت کی بات تھی اب نہیں) (دیکھیے ابن سعد: ۱/ ۱۳۸، البلاذری، انساب الاشراف: ۱/۸۱) اول تو یہ روایت سلسلۂ سند کے لحاظ سے انتہائی ضعیف ہے۔ اور دوم یہ کہ یہ بات جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں شرفاء کے مروجہ طریقے کے خلاف تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ بات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والد محترم کے اعلیٰ ترین اخلاق اور ان کی پاکیزہ عادتوں کے بھی خلاف تھی۔ کہ وہ اس نوع کی کسی پیشکش کو قبول کریں۔

(۶۲) ابن سعد،۱/۸۱.

(۶۲۔الف) ابن حزم۔ محمد الانساب العرب: ص ۶۶۔۶۷، البلاذری، الانساب الاشراف: ۹۲/۱

(۶۳) ایضاً ۸۲/۱.

(۶۴) ابن سعد ۳۶/۱-۳۹.

(۶۵) ایضاً ۷۶/۱.

(۶۶) ایضاً

(۶۷) ایضاً ۸۴/۱.

(۶۸) ابن سعد، ۱۱۶/۱.

(۶۹) ابن سعد، ۹۸/۱.

(۷۰) علامہ طاہر کردی، تاریخ القدیم، ۷۸/۱-۸۳؛ محمد عبدالمعبود، تاریخ المکۃ المکرمہ، ۳۱۸/۱.

RAHAT PUBLISHERS

ISBN 978-969-9202-04-9